

کے دو ماتحتوں کو بیان دینے کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ دونوں بھی یہودی ہی تھے۔ یونیورسٹی نے عارضی طور پر مجھے کلاسیں لینے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ انکوائری مکمل ہونے تک مزید کسی بڑے ”ہنگامے“ سے بچنا چاہتے تھے۔

یونیورسٹی میں جب یہ خبر پھیلی تو میری ساری کلاس باہر نکل آئی۔ طلباء نے میرے حق میں نعرے بازی شروع کر دی، انہوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے کارڈ اور بینراٹھالے جن پر ”انصاف۔۔۔۔۔ انصاف۔۔۔۔۔ انصاف“ لکھا ہوا تھا۔ طلباء کی قیادت ربیکا اور جم کر رہے تھے۔ جم خاصا مشتعل تھا اور اس نے انتظامیہ کو دھمکی دے دی تھی کہ اگر مجھے کلاس لینے کی فوری اجازت نہ دی گئی تو وہ تمام طلباء کو لے کر باہر سڑک پر نکل جائے گا اور یہ ہڑتال پورے شہر کی تعلیمی درس گاہوں تک پھیلا دی جائے گی۔ یونیورسٹی کا میدان، نہر کنارے، راہداریوں اور چھتوں پر ہر جانب اسٹوڈنٹس ہی دکھائے دے رہے تھے۔ میں جب کلاس سے نکل کر باہر آیا تو ان سب کے نعروں میں شدت آ گئی۔ ان سب کو ایک اجنبی لڑکے کے لیے اس طرح لڑتے دیکھ کر میری آنکھوں کے گوشے خود بخود بھیگ گئے۔ مجھے لگا ایمان کسی ستون کی اوٹ سے مسکرا کر جھانک رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ ”میں نے کہا تھا نا۔۔۔۔۔ تم کبھی اکیلے نہیں ہو گے۔۔۔۔۔ میں ہر لمحہ محبت کی صورت میں۔ دوستی کی صورت میں تم پر برستی رہوں گی۔ میری محبت روپ بدل بدل کر تمہارے ارد گرد منڈلاتی رہے گی۔ میں تمہیں اتنا معتبر کر دوں گی کہ لوگ تم پہ مرنے کے لیے ہر دم تیار رہیں گے۔ میری محبت ہر لمحہ تمہارے گرد عظمت اور حفاظت کا دھار بنائے رکھے گی۔“

جم نے مجھے یوں گم صم بھیگی آنکھوں کے ساتھ کھڑے دیکھا تو وہ آگے بڑھا اور اس نے مجھے گلے سے لگالیا۔ ساری یونیورسٹی نعروں سے گونج اٹھی۔ میں رو پڑا، آنسو خود بخود میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ جم نے میرے وجود کو اور مضبوطی سے گلے لگالیا۔ ربیکا نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو صاف کر دیے اور دھیرے سے میرے کان میں بولی۔

”فکر مت کرو باغی لڑکے۔۔۔۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“

میں نے سارہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

شدید دکھ، شدید جلن کا احساس ہوا تھا۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ تمہارے جذبات سارہ کے لیے ہیں۔ اور میں سارہ سے بھی شدید ناراض ہو گئی تھی۔ لیکن کل سارہ نے جب زبردستی یہیں اسی نہر کے کنارے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب بٹھالیا اور اس نے مجھے ایمان کے بارے میں بتایا تو یقین کرو میں شرم اور ندامت سے خود سے بھی نظر نہیں ملا پارہی تھی۔ میری محبت تو بہت سطحی نگلی میڈی۔۔۔۔۔ اصل میں تو محبت تم نے کی ہے۔۔۔۔۔ ہم سب کو ایسی محبت کے پہلے پہر کے بھی حق دار نہیں ہو سکتے۔ مجھ جیسے کم حوصلہ اور کم ظرف محبت کی شام تک بھلا کیسے پہنچ پائیں گے۔“

وہ سر جھکا کر بیٹھی دھیرے دھیرے بولتی رہی۔ دل کا غبار اپنے آنسوؤں سے دھوتی رہی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔

”ایسا نہیں ہے ربی۔ تم تو ایک لمحے میں ہی محبت کے تینوں پہر پھلانگ کر محبت کی شام میں پہنچ گئی ہو۔ ورنہ آج اس وقت یوں اس طرح میرے پاس بیٹھ کر یہ سارے اعتراف نہیں کر رہی ہوتیں۔ اصل میں تو تم ہی محبت کی اس شام کی حق دار ہو۔ ٹھنڈی اور میٹھی محبت کی شام۔۔۔۔۔ جو اس وقت تمہارے آس پاس ہی کہیں منڈلا رہی ہے۔“

ربیکا رو پڑی۔

”نہیں حماد۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہوتا تو میرا دل درد سے یوں کٹ نہ رہا ہوتا، مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ دل اب بھی یوں نہ تڑپ رہا ہوتا۔ میں تمہارے سامنے بیٹھی یوں کم ظرفوں کی طرح آنسو نہ بہا رہی ہوتی۔ میں تو اتنی ناشکری ہوں کہ میں تمہاری انمول دوستی کی قدر بھی نہیں کی۔ تمہاری محبت پانے کی خواہش میں اس دوستی کو بھی رد کرتی رہی تم مجھے اس بات کے لیے کبھی معاف مت کرنا۔۔۔۔۔ کبھی مجھ پر رحم نہ کھانا۔“

وہ بولتے بولتے ہلکے ہلکے پڑی۔ میں نے اس کا سراپے شانے سے لگالیا۔ اور اسے کھل کر رونے دیا۔ محبت کا کاٹنا جب جسم میں چبھ جائے تو اس کا زہر بدن سے صرف اور صرف آنسوؤں کی صورت میں ہی نکالا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس زہریلی محبت کا ذائقہ بھی نمکین ہی ہوتا ہوگا۔

دوسرے دن مجھے پتہ چلا کہ پیٹر نے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر لائبریری ہی



یہ صلاحیت رکھتے ہو کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی ان سب کو گمراہ کر سکو، بھڑکا سکو، تمہاری موجودگی اس یونیورسٹی کی سلامتی کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔“

سر آئزک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس وقت مجھے اور اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

”آپ ایک طرفہ فیصلے کرنے کے عادی لگتے ہیں سر۔ آپ نے ایک طرفہ طور پر فیصلہ کر کے مجھے کلاسز لینے سے منع کر دیا لیکن میں نے اس پر بھی کوئی احتجاج نہیں کیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ انکوائری میں کوئی خلل پڑے۔ اس وقت بھی جیوری جو فیصلہ کرے گی۔ مجھے قبول ہوگا۔“

میرا جواب سن کر سر آئزک دانت کچکا کر ہی تو رہ گئے۔ وہ مجھے جیوری کے سامنے اشتعال دلوا کر کچھ مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اب میں بھی اس کھیل کو پوری طرح سمجھنے لگا تھا۔

جیوری نے مجھے مطلع کیا کہ وہ غیر مشروط طور پر مجھے کلاس لینے کی اجازت تو دی رہی ہے لیکن دو دن بعد ہونے والی بڑی تقریب میں میں اپنا ٹرم پیپر یونیورسٹی کی لائبریری یا ریکارڈ میں جمع نہیں کروا پاؤں گا تا وقتیکہ میرے خلاف انکوائری میرے حق میں ختم نہیں ہو جاتی۔ فیصلہ سنا کر جیوری کے ممبروں نے اٹھتے اٹھتے مجھ سے یہ درخواست بھی کہ میں اپنے بطور پریزنٹوں کو باہر جا کر کنٹرول کروں اور تمام اسٹوڈنٹس کو کلاس میں جانے پر مجبور کروں کیونکہ ان کے اس برتاؤ سے بات اب یونیورسٹی کی دیواروں سے باہر جانے لگی تھی جس سے یونیورسٹی کی بدنامی کا خدشہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے جیوری سے وعدہ کیا کہ میں اسٹوڈنٹس سے ہڑتال ختم کرنے کی اپیل ضرور کروں گا۔ جیوری ارکان باہر نکل گئے۔ میں بھی واپس جانے کے لیے پلٹا۔ سر آئزک جواب بھی بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے رک گئے اور مجھے پیچھے سے آواز دی۔

”مسٹر حماد۔۔۔۔۔ سارہ میری اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی ہے، لیکن ابھی بہت نادان ہے۔ اگلے سال میں نئے اور اس کی ماں نے اس کی شادی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ لڑکا ہمارے خاندان کا ہے اور ہماری امیدوں کا چراغ ہے۔ امید ہے تب تک تم اس یونیورسٹی میں رہو

اتنے میں ڈین آئزک کے کمرے سے اعلان ہونے لگا کہ میں جہاں کہاں بھی ہوں۔ فوراً ان کے کمرے میں پہنچوں۔ ایک بار پھر شور مچ گیا۔ سب میرے ساتھ ہی ڈین کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میرا ایک ہاتھ جم نے اور دوسرا ربیکا نے تھام رکھا تھا۔ ان سب کو کمرے کے باہر چھوڑ کر میں اندر داخل ہوا تو میری نظر سارہ پر پڑی جو غصے میں سرخ چہرہ لیے ڈین کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ دروازے میں ہی اس کا میرے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ اس نے چند لمحے میری جانب دیکھا۔ پھر نکلے نکلے اس نے میرا ہاتھ اک گھڑی کے لیے تھاما اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”فکرمات کرنا۔۔۔۔۔ یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔۔۔ میں نے تمام اسٹوڈنٹس کی طرف سے ہڑتال کی کال جمع کرادی ہے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ یہ تمہیں کیسے یہاں سے باہر کرتے ہیں۔“

سارہ میرا ہاتھ چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ اندر کمرے میں سر آئزک انتہائی غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ سارہ کو مجھ سے بات کرتے دیکھ کر تو ان کا چہرہ بالکل ہی بگڑ گیا تھا۔ سامنے میز پر پرلی جانب جیوری کے دو اور ارکان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سر آئزک میری طرف پلٹے اور غصے میں غرائے۔

”دیکھ رہے ہو مسٹر حماد امجد رضا۔۔۔۔۔ تمہاری وجہ سے آج اس یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ڈسپلن کی کیسی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ یونیورسٹی کے نام پر دھبہ لگ گیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس یونیورسٹی میں طلباء نے میرے حکم کے خلاف جانے کی جرأت کی ہے۔ بغاوت کی ہے۔۔۔۔۔ اور اس سب کے ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو۔“

میں نے سکون سے ان کی بات سنی۔

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ مجھے تو یونیورسٹی آئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ آپ گیٹ کارجر دیکھ سکتے ہیں۔ جب کہ یہ تمام اسٹوڈنٹس تو صبح 9 بجے سے آپ کے دفتر کے باہر بلکہ پوری یونیورسٹی میں جمع ہو چکے تھے۔“

”تم اس قدر خطرناک ہو کہ تمہاری موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم



سارہ اور ربیکا دونوں ہی ہنس پڑے۔ ربیکا نے ٹھنڈی آہ بھری۔  
 ”اب سر آ نرک کو کون سمجھائے کہ تم کسی لڑکی کو نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ مجھ جیسی کئی لڑکیاں  
 تمہیں اپنے ساتھ بھگالے جانے کی تاک میں ہیں۔“  
 ربیکا یونہی سب کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرتی رہی لیکن میں نے نوٹ کیا کہ سارہ اس  
 وقت ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ نہ تھی۔ جانے اس کے دھاگے کہاں  
 اُچھے ہوئے تھے۔

OO

یونیورسٹی کا بڑا ہال کچا کھج بھرا ہوا تھا۔ آج سب طالب علم اپنا اپنا ٹرم پیپر جمع کروانے  
 کے بعد ہال میں جمع ہوئے تھے۔ یہاں پر آج چند بہترین طالب علموں کو اپنا پرچہ اور اپنی  
 تحقیق باقی طالب علموں کے سامنے پڑھ کر سنانے کا موقع دیا گیا تھا۔ انتظامیہ نے فیصلہ کیا  
 تھا کہ آج صرف تین اسٹوڈنٹ جنہوں نے پچھلے سمسٹر میں یونیورسٹی بھر میں پہلی تین پوزیشنز  
 حاصل کی تھیں۔ وہی اپنا منتخب ٹرم پیپر حاضرین کے سامنے پیش کریں گے۔ خاصی بڑی  
 تقریب تھی۔ لندن کے میئر صاحب حسب معمول مہمان خصوصی تھے۔ لوگوں کی تعداد پچھلے  
 چند ہفتوں سے جاری انتظامیہ اور میرے درمیان چیقلش کی وجہ سے بھی بہت زیادہ تھی۔  
 جانے یہ خبر کہاں کہاں گردش کرتی رہی تھی۔ سائنس کے اس دور میں لوگوں کو لاعلم رکھنا بھی  
 بہت مشکل کام ہے۔ انہی میں اخباری رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کی بڑی تعداد بھی شامل تھی جو ہر  
 سال کی طرح اس سال بھی یونیورسٹی کی اس خاص تقریب کی ترویج کے لیے یہاں اکٹھے  
 ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت کم ہی ایسے ہوں گے جو میرے چہرے سے واقف ہوں گے  
 لیکن بقول جوزف ان میں سے ہر ایک کم از کم میرے نام سے ضرور واقف تھا۔

کچھ ہی دیر میں سر آ نرک نے اسٹیج پر آ کر مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ ان چند بڑے  
 ناموں کا اعلان کیا جو یونیورسٹی کو لاکھوں پاؤنڈ سالانہ چندہ دیتے تھے اور جن میں سے اکثر  
 اس وقت اس تقریب میں ہال کی پہلی رد میں موجود بھی تھے۔ یہ سب کے سب نام یہودیوں  
 کے ہی تھے۔ ان میں سے اکثر کی اپنی اولادیں بھی اسی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھیں تقریب کا

گے تاکہ سارہ کی شادی میں شریک ہو سکو۔ ظاہر ہے بطور اس کے بہترین دوست یہ تمہارا حق  
 بھی ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں سر۔۔۔۔۔ سارہ واقعی میری بہترین دوست ہے اور اگر اس کی  
 شادی میں شریک ہونے کے لیے مجھے اپنے ملک سے بھی دوبارہ یہاں واپس آنا پڑا تو میں  
 اس کی شادی میں شرکت کے لیے ضرور آؤں گا۔ مجھے بس آپ کے دعوت نامے کا انتظار  
 رہے گا۔“

میں سر آ نرک کو خود کو گھورتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ تو گویا یہاں بھی مذہب  
 کے ساتھ ساتھ ایک محبت کرنے والا باپ بھی میرے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ جو یہ سمجھتا تھا کہ  
 میں اُس کی لاڈلی بیٹی کو اس سے چھین کر لے جانے آیا ہوں۔ کیا ساری دنیا کی بیٹیوں کے  
 باپ ایک سا ہی سوچتے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں مولوی علیم الدین اور یہاں سر آ نرک۔

میں نے بڑی مشکل باہر جمع لڑکوں کو دوبارہ کلاس میں جانے پر آمادہ کیا۔ جم  
 کے تو باقاعدہ ہاتھ پیر جوڑنے پڑے تب جا کر وہ کہیں ٹلا۔ ربیکا اس بات پر بھی بے حد خفا تھی  
 کہ میں نے اندر ٹرم پیپر پیش نہ کرنے کی شرط پر حامی کیوں بھری۔ میں نے اسے سمجھانے کی  
 کوشش کی کہ اصل میں یہ سارا کھیل ہی مجھے اس پیپر کو پیش نہ کرنے کی خاطر کھیلا گیا تھا۔ اور  
 میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے دوسرے کسی طالب علم یا جم وغیرہ کو بھی عتاب کا نشانہ بنایا  
 جائے۔ مجھے انکو اڑی کے خاتمے تک انتظار کرنا ہی تھا۔ سارہ بھی وہیں کھڑی چپ چاپ  
 ہماری بحث سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ جیسے اس کے اندر بہت  
 سے سوال پچل رہے ہوں لیکن وہ انہیں پوچھ نہیں سکتی ہو۔ جیسے اس کے اندر ایک جنگ سی  
 جاری ہو۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے آگے چٹکی بجا دی۔ وہ  
 چونک سی گئی، میں نے اُسے چھیڑا۔

”ہے مس آ نرک۔۔۔۔۔ دیکھا لوگ ہم سے کس قدر خوف زدہ ہیں۔ مسلمان نام اتنا  
 خوف ناک تو نہیں تھا کبھی۔۔۔۔۔ تمہارے پاپا نے تو ابھی سے مجھے تمہاری مستقبل کی  
 شادی میں باراتی کی حیثیت سے دعوت نامہ بھی دے ڈالا ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ کہیں میں  
 تمہیں بھگا کر نہ لے جاؤں۔“



شاید اس وقت تک مجھے تحقیق کرنے کی اتنی عادت نہیں تھی یا صرف تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتے رہنے کی وجہ سے میں نے دوسرے رخ کو پلٹنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن آج میرا ٹرم پیپر پوری تحقیق اور دلائل کے بعد مرتب ہوا ہے۔ میرے پاپا۔۔۔۔۔ سر آنرک نے مجھے ہمیشہ ڈکنے کی چوٹ پر سچ بولنے اور سچ سننے کی تربیت دی ہے اور سچ یہ ہے کہ آج اگر میں آپ سب کے سامنے اس اسٹیج پر فخر سے کھڑی ہوں تو یہ فخر دینے والے اصل میں میرے پاپا، میرے سب سے بڑے استاد خود ہیں۔“

سارے ہال نے سارہ کی اس بات پر تالیاں بجائیں۔ سر آنرک کا سر فخر سے مزید تن گیا، سارہ نے پہلا صفحہ ختم کر کے دوسرا صفحہ پلٹا۔

”ہالوکاسٹ، پر تحقیق کے دوران میں نے سچ اور مفروضے کی ایک عجیب سی جنگ دیکھی۔ یہ جنگ باہر بھی ہو رہی تھی اور خود میرے اندر بھی، میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ لوگوں کو سچ کہنے اور سچ سننے سے اس قدر گریزاں دیکھا۔ ایک عجیب انسان ہماری زندگیوں میں آیا اور اس نے سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ میں نے اپنے پاپا کے بعد سچ کا دوسرا سبق اسی انسان سے سیکھا۔ میں نے یہ بھی سیکھا کہ کوئی کس طرف سچ پر قدم جما کر کھڑا ہو سکتا ہے اور ساری کائنات سے ٹکر لینے کی ہمت کر سکتا ہے۔ میرا آج کا ٹرم پیپر، یہ تحقیق اور یہ تجربہ دراصل میری نہیں ہے، بلکہ اسی سچے انسان کی تحقیق ہے جس کا نام حماد رضا ہے۔“

ہال میں جیسے کسی نے بم کا دھماکا کر دیا ہو، اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سر آنرک غصے میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کسی سے چلا کر مائیک بند کر دینے کا کہا لیکن تب تک جم اور ڈیوڈ وغیرہ نے ہال کے آڈیوسٹم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اونگھتے ہوئے رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کے جسم میں جیسے کسی نے بجلی سی بھردی تھی۔ وہ دھڑا دھڑا سارہ اور دیگر لوگوں کی سر آنرک سمیت تصاویر بنانے لگے۔ میز نے آہستہ سے سر آنرک کے کان میں کچھ کہا شاید ان کی توجہ اخباری رپورٹرز کی طرف متوجہ کروائی۔ سر آنرک بے بسی کے عالم میں خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اور بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئے۔

خود میرے لیے بھی یہ کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سارہ اپنے پرچے کی جگہ میرا پرچہ پڑھنے کے لیے لے آئے گی۔ اس نازک سی لڑکی کی

بات قاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے چند طلباء طالبات کو ان کی غیر معمولی قابلیت پر سند اور میڈل وغیرہ دیے گئے۔ اس کے بعد ان اسٹوڈنٹس کو اپنا پرچہ پڑھنے کی دعوت دی گئی جن کے نام آج کی فہرست میں شامل تھے۔ ان ناموں میں سارہ کا نام بھی شامل تھا کیونکہ پچھلے سیکسٹر میں بھی ہمیشہ کی طرح اس نے ہی پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

سب سے پہلے جیسی فوکس نامی لڑکی نے معاشیات پر اپنا پرچہ پڑھا اور ہال سے خوب داد وصول کی۔ اس کے بعد مارٹن نامی سال اول کے طالب علم نے لندن کی پرانی عمارتوں کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کی۔ اس کا پرچہ بھی واقعی لا جواب تھا۔ ہال نے اسے بھی جی بھر کے ستائش کا انعام دیا۔ اس کے بعد سارہ کا نام پکارا گیا۔ بلیک کوٹ اور بلیک ٹراؤزر میں ملبوس سارہ نے سفید قمیض کے ساتھ اپنا پسندیدہ اسکارف بھی گلے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے مجھے ایک دن بتایا تھا کہ سرخ رنگ کا یہ اسکارف وہ صرف خاص موقعوں پر ہی پہنتی تھی۔ آج بھی اُس نے اپنے لمبے بال پیچھے کس کر باندھے ہوئے تھے اور دُور سے بالکل کسی کا نوٹ اسکول کی طالبہ ہی تو لگ رہی تھی۔ سارہ کا نام پکارے جانے پر ہماری ساری کلاس نے خوب شور مچایا جن میں جم اور ربیکا سرفہرست تھے۔ سارہ مسکراتی ہوئی اسٹیج پر چڑھ گئی۔ اس نے ہال کے تمام حاضرین کا اور صدر تقریب کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر اُس نے اپنے سامنے اسٹیج پر بنے چھوٹے سے شیشے کے روسٹرم (ڈائس) پر رکھے اپنے پرچے کا پہلا صفحہ پلٹا۔

”جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ میرے پرچے کا عنوان ہے ”ہالوکاسٹ۔۔۔۔۔ ایک نظریہ یا ایک حقیقت؟۔۔۔ آج سے تین ماہ پہلے بھی میں نے اسی موضوع پر پہلے حصے کی حیثیت انعام بھی حاصل کیا تھا۔ آج میں اُسی پہلے حصے کا دوسرا حصہ آپ سب کے سامنے پیش کرنا چاہوں گی۔ اُمید ہے آپ سب کی توجہ مجھے حاصل رہے گی۔“

پہلی قطار میں بیٹھے سر آنرک فخر اور مسرت سے اپنی بیٹی کا بااعتماد انداز دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ساتھ بیٹھے میز اور چند دیگر خصوصی مہمانوں کو بھی دھیرے سے بتایا کہ سارہ ان کی بیٹی ہے۔ سب نے ستائش انداز میں سر ہلائے۔ سارہ کی بات جاری تھی۔

”یہاں میں اس بات کا اعتراف کرنے لیں کوئی عار محسوس نہیں کرتی کہ پہلے حصے کو تحریر کرتے وقت میں نے تحقیق کی بجائے زیادہ تر مواد اکٹھا کرنے پر اپنی توجہ قائم رکھی تھی۔



کیوں ہیں۔ پچھلے کئی دنوں میں میں نے دوسری جنگ عظیم سے لے کر ہالوکاسٹ کا نظریہ سامنے آنے تک کے دور کے ہر اخبار، ہر رسالے ہر خبر کو چھان مارا ہے لیکن مجھے اتنی بڑی ہلاکتوں کی خبر جرمن دشمن اخبارات اور رسائل میں بھی نہیں ملی۔ آخر کیوں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ ”ہالوکاسٹ“ کا الزام تو جرمنوں پر لگایا جاتا رہا ہے لیکن اس وقت کی یہودی قوم کی طرف سے دباؤ ہمیشہ فلسطین اور قبلہ اول اور گولان کی پہاڑیوں کی طرف نقل مکانی کی صورت میں ہی کیوں نکالا گیا۔ میں جانتی ہوں کہ قبلہ اول ہر یہودی کے لیے اپنی زندگی سے زیادہ مقدس ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ اس نقل مکانی کے لیے ہالوکاسٹ کے نظریے کا ہی سہارا لیا جاتا۔۔۔ کیا کوئی مجھے جرمنوں کے خلاف اٹھائے جانے والے کسی اقدام کے بارے میں بتائے گا۔۔۔؟ اصل مجرم تو یہودیوں کے نزدیک جرمن تھے۔۔۔ لیکن ان کے خلاف ایسا کچھ نہیں کیا گیا جس کا کوئی قابل ذکر کہیں بھی سنائی دیا ہو۔۔۔؟ آخر کیوں۔۔۔؟

پھر سارہ نے ان تمام تصنیفات کے نام پڑھے جن سے میں نے ہالوکاسٹ کے نظریے کے خلاف شواہد اکٹھے کیے تھے اور تمام اسٹوڈنٹس کو ان تصانیف کو ایک بار پڑھنے کا مشورہ بھی دیا۔ مجھے یقین ہے اتنے دنوں میں سارہ نے خود بھی ایسی ہر ایک تصنیف کو چھان مارا ہوگا جس کا حوالہ میں نے اپنے پرچے میں دے رکھا تھا۔ آخر میں سارہ بولی۔

”بحث یہ نہیں ہے کہ ”ہالوکاسٹ“ مفروضہ ہے یا حقیقت۔ بحث تو اب یہ ہے کہ سچ کو زمانے کے سامنے پیش کرنے سے اور سچ بولنے سے اس قدر خوف کیوں۔۔۔؟ میں اپنی نئی نسل کو اس بات کی دعوت دیتی ہوں کہ ہمیں خود آگے بڑھ کر سچ کے نقاب کو الٹ دینا چاہیے۔ اگر ہمارے بزرگوں نے اس وقت کچھ مقاصد حاصل کرنے کے لیے غلط بیانی سے کام لیا تھا تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں۔ کیوں تاہم خود چل کر سچ کو تلاش کریں حماد امجد رضا کا یہ ٹرم پیپر تو صرف ایک ابتدا ہے۔ ہماری نئی نسل کو سچ کی طرف بلانے کی ابتدا۔ حماد نے اس پرچے میں کہیں بھی نہیں لکھا کہ ”ہالوکاسٹ“ سراسر جھوٹ ہے۔ لیکن اس نے اس کے مفروضے کے سچے ہونے پر انگلی اٹھائی ہے۔ اس نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ ایک قوم کے مظالم اگر ثابت ہو بھی جائیں تب بھی اس کا بدلہ کسی سازش

جراتوں کی حد جانے کہاں جا کر ختم ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہت مشکل۔۔۔۔۔ سارہ کی تقریر جاری تھی۔

”نظریہ ہالوکاسٹ کی ابتدا صیہونی ورلڈ آرڈر کے اسرائیلی لیڈر اور وزیراعظم ڈیوڈ بن گورین کی تحریک سے شروع ہوتی ہے اور اس کے لیے جرمنی کے لیڈر اور دوسری جنگ عظیم کے ایک مشہور کردار ہٹلر کو ہدف بنایا گیا۔ وجہ برطانیہ اور امریکہ کی یہودی رہنماؤں کو یہ یقین دہانی تھی کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد سلطنت یہودیوں کے نام ہوگی۔۔۔۔۔

سارہ میرا پیپر پڑھتی جا رہی تھی اور ہال پر اک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جرمن اور ہٹلر ہی ہدف کیوں بنے۔۔۔۔؟ جواب ہٹلر کی یہودی دشمنی سے ظاہر ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہودیوں کو جرمنی بدر کر دیا گیا۔ اسلحے اور دیگر جنگی ساز و سامان کی فیکٹریاں یہودیوں سے چھین لی گئیں۔ کلیدی اسامیوں اور عہدوں سے یہودیوں کو ہٹا کر جرمن باشندوں کو تعینات کر دیا گیا تھا اور یوں یہودی جرمنی کے خلاف ہو گئے۔ یہ سلوک نہ صرف جرمنوں نے بلکہ رومانیہ اور دیگر کئی ملکوں نے بھی یہودیوں کے ساتھ روا رکھا۔ اور یہیں سے ہالوکاسٹ کے نظریے کی ابتدا ہوئی۔ شروع میں میں نے بھی بغیر تحقیق کے اس حق میں چھپنے والی بہت سی کتابوں سے حوالے لے کر اسے سچ مانا لیکن آج حماد رضا اس کے پرچے اور اس کی تحقیق کے نتیجے میں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہودی مصنفین اور محقق آج تک اتنی بڑی ہلاکتوں کے بارے میں ایک بھی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ جرمنوں کے ہاتھوں یہودیوں کی ہلاکتیں تو ضرور ہوئی تھیں لیکن اصل تحقیق اور تمام تر شواہد اور ثبوت چند ہزار ہلاکتوں سے زیادہ کی تصدیق نہیں کر پائے۔“

سر آئزک نے غصے میں اٹھ کر دوبارہ ہال سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک ہال سے باہر موجود لوگ بھی اندر گھس آئے تھے اور دروازوں کے قریب اور ہال کے اندر نشستوں کے درمیان بنے راستوں میں اس قدر ہجوم تھا کہ وہ تمللا کر وہیں کہیں بھٹکتے رہ گئے۔ سارہ بولتی رہی۔

”دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اتنے بڑے پیمانے پر جرمن فوج نے یہودی قتل عام کیا بھی تھا تو اس وقت کے اخبارات، جرائد اور رسائل اس بارے میں اس قدر خاموش



دفعۃً ایمان کی جگہ پھر سارہ نے لے لی، ہم دونوں کے گرد ربیکا، جم ڈیوڈ اور ٹینا نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گھیرا سا ڈالا ہوا تھا تا کہ ہم ہجوم کے دھکوں سے بچ سکیں۔ میں نے سامنے کھڑی سارہ کے بال ہاتھ بڑھا کر بکھیر دیے، سارہ مسکرا دی، سارا ہال مسکرا دیا۔ ساری دُنیا مسکرا دی۔ ساری کائنات مسکرا دی۔

00

میں اپنی اور ہر قوم کی نئی نسل کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ ”ہالوکاسٹ“ اور اس جیسے کسی بھی مفروضے کی حقیقت کو جاننے کے لیے خود تحقیق کریں۔ خود قدم آگے بڑھائیں۔ چاہے وہ مفروضہ کسی بھی قوم یا نسل سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ اپنی دوستی اور دشمنی کی بنیاد اس نئی نسل کو خود رکھنی ہوگی۔ ہم سے پہلے گزرے ہوئے ہمارے بڑوں کی دشمنیاں ہمیں ان کے ساتھ ہی دفنانا ہوں گی۔“

سارہ نے میرے ٹرم پیپر کا آخری صفحہ بھی ختم کر دیا۔ اور اسٹیج سے اترنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ ہال پر بہت دیر تک ایک موت کا سا سکوت طاری رہا۔ اور پھر سب سے پہلے لندن کے میئر اور مہمان خصوصی نے اٹھ کر سارہ کے لیے تالی بجائی۔ پھر اس کے بعد، دو، دو کے بعد چار اور چند لمحوں میں ہی ہال تالیوں، نعروں اور تعریفی کلمات کے شور سے جیسے پھٹنے لگا۔ سارہ کے پیچھے اخباری فوٹو گرافرز کی فلش مشین کی روشنی جھماکے کر رہی تھی۔ وہ اسٹیج سے اتر کر سیدھی میرے پاس آئی اور ٹرم پیپر میری طرف بڑھا کر مسکرائی۔

”یہ لو اپنی امانت۔۔۔۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس یونیورسٹی کے ہر طالب علم



## نوجوان انقلاب

رات یونیورسٹی کی تقریب سے میں بہت دیر بعد فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ ربیکا نے تقریب کے بعد اپنے خاص دوستوں کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ وہاں سے آتے آتے آدھی رات ہی ہو گئی تھی۔ میں آتے ہی بستر پر پڑ کے سو گیا تھا۔ پھر نہ جانے کس وقت مجھے کامران کے شور نے جگا دیا۔ وہ میرے ہی کمرے میں چلاتا ہوا داخل ہو رہا تھا۔

”اوہ تو میرا شہزادہ پورے شہر میں آگ لگانے کے بعد یہاں پڑا سو رہا ہے۔“ میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

”تم آج ریسٹورنٹ نہیں گئے اپنے۔“

”وہیں سے آ رہا ہوں۔ وہاں بھی تمہارے ہی فدائین کا ہجوم جمع ہے۔ جو تمہارے دیدار کے لیے ترس رہے ہیں۔ سارے شہر کے اخبارات میں کل یونیورسٹی ہال میں کی گئی اس یہودی سینہ کی تقریر کے چرچے ہیں۔ تم دونوں کی تصویروں کی دھوم ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ آج اگر تم یہاں سے الیکشن لڑنے کا اعلان کر دو تو بلا مقابلہ میسر کا انتخاب جیت جاؤ گے۔ یہ گوری نئی نسل جب کسی کونسر پر بٹھاتی ہے تو پھر اُترنے نہیں دیتی۔“

کامران نے آج کے اخبارات کا موٹا سا پلندا میری طرف پھینکا۔ ہر اخبار کے پہلے صفحے پر سارہ کی تقریر کے دوران اور پھر میرے ساتھ کھڑے مجھے ٹرم پیپر واپس کرتے ہوئے کی تصویر اور ایسی کئی دیگر تصاویر چھپی ہوئی تھی۔ تقریباً ہر اخبار نے اس واقعے کو اور سارہ کی تقریر کو ”نوجوان انقلاب“ سے تشبیہ دی تھی۔ چند ایسے اخبارات نے جن کے مالکان یہودی تھے یا پھر یہودیوں کے زیر اثر تھے اور انہی کے چندے سے چلتے تھے، سارہ کی تقریر اور ہالوکاسٹ پر میرے پرچے پر زبردست تنقید بھی کی تھی۔ اسے ایک جذباتی باتوں کا پلندا قرار دیا تھا لیکن اس وقت ان کی تنقید بھی ہماری شہرت کو بڑھانے کی ایک وجہ بن گئی تھی۔ اس

نازک لڑکی کی جرأت نے میری بات شہر کے ہر گلی کوچے میں پہنچا دی تھی اور کل تک انہی اخبارات کے ذریعے پورے یورپ میں اور پھر انٹرنیٹ کے ذریعے ساری دنیا میں پہنچنے والی تھی۔ لوگوں میں ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا تھا۔ نوجوان نسل نے سچ کی تلاش کے عنوان سے اپنے بڑے بزرگوں کو انہی اخبارات میں دعوت دی تھی کہ وہ ان کی مدد کریں، سچ جاننے میں اور سچ کو پھیلانے میں۔ سارہ نے سچ ہی کہا تھا۔ یہ قافلہ اب چل پڑا تھا۔ اس قافلے کی سربراہی خود سارہ ہی تو تھی۔

چند اخبارات نے جو یہودی اثر میں تھے۔ پیئر کے ساتھ میرے فرضی جھگڑے کو بنیاد بنا کر اور اُسے بڑھا چڑھا کر بیان کر کے میری کردار کشی کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ سارہ اور میرے تعلق پر بھی انگلیاں اٹھائی گئی تھیں۔ ان اخبارات نے خاص طور پر سارہ کے بال بکھراتے میرے بڑھے ہاتھوں والی تصویر کو شائع کیا تھا۔ گویا جنگ چھڑ چکی تھی۔ کچھ اخبارات نے مجھے خاص قوم کا ایک خطرناک ایجنٹ بھی قرار دیا تھا۔ جو ایک خاص ایجنڈہ لے کر یونیورسٹی آیا۔ لیکن زیادہ تر اخبارات نے کیچڑ اُچھالنے کی بجائے میرے پیغام کو آگے بڑھایا تھا۔ سوچنے کے پیغام کو، تحقیق کر کے سچ کے جاننے کے پیغام کو، سارہ کی توہراخبار نے زبردست تعریف کی تھی۔ اسے روایتوں سے ہٹ کر دنیا کے سامنے کھڑی ہونے والی لڑکی قرار دیا تھا۔ اُسے نئی نسل کی آواز کہا تھا، میرا مقصد پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ بحث شروع ہو چکی تھی اور میں جانتا تھا یہ بحث آگے چل کر نئی نسل کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے والی تھی۔

لیکن اخبارات میں اکادکا چند ایسے واقعات کی بھی نشان دہی کی گئی تھی جو میرے لیے کافی تشویش کا باعث تھے۔ لندن کے مضافات میں اور چند یہودی آبادیوں کے ارد گرد تشدد کے اکادکا واقعات کا بھی ذکر تھا جو سارہ کی اس تقریر کے نتیجے میں پیش آئے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ شدت پسندی اور انتہا پسندی کا الزام تو ہم پر لگایا جاتا رہا ہے ہمیشہ اور ایک تسلسل کے ساتھ، لیکن ان تنگ نظر یہودیوں کی طرزف کسی کا دھیان نہیں جاتا تھا جنہوں نے اپنی ہی نسل کی ایک معصوم لڑکی کی ایک سچی پکار کو نسلی تعصب کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے دو بجے آج یونیورسٹی جانا تھا لیکن کامران نے مجھے اکیلے جانے نہیں دیا۔ اُسے ان



طور پر آج مجھے چھٹی والے دن پیشی کے لیے بلایا گیا تھا۔

نئے آنے والے بھاری بھر کم اور موٹی توند والے صاحب کا نام پار کرتھا۔ وہ لندن کی خفیہ پولیس کے سیکشن انچارج تھے، ان کے ساتھ خفیہ ایجنسی ایم۔ آئی، کے دو اہلکار بھی موجود تھے۔ پیٹر نے پھر سے اپنی رام کہانی سنائی۔ اس مرتبہ دونوں گواہوں نے بھی بیانات دیے۔ میرا بیان تو پہلے سے وہی تھا کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا لیکن جیوری نے میرا اعتراض رد کر دیا اور بالآخر فیصلہ سنا دیا کہ مجھے فوری طور پر یونیورسٹی کے اس ٹرم سمسٹر سے فارغ کیا جاتا ہے اور پیٹر کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ ہتک عزت کا دعویٰ کرنا چاہے یا اگر اُسے مجھ سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا تو وہ پولیس سے بھی رابطہ کر سکتا تھا۔ شاید اسی لیے آج مجھے یہاں پولیس والے حضرات بھی نظر آ رہے تھے۔

پارکر اس تمام کارروائی کے دوران غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے سر آئزک سے پوچھا کہ کیا مجھے اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی کی حد تک تو فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ البتہ میں چاہوں تو لندن کی کسی عدالت میں اس فیصلے کے خلاف جاسکتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے دے لفظوں میں یہ دھمکی بھی دی کہ انہوں نے پیٹر کو فی الحال پولیس میں میرے خلاف جانے سے اسی شرط پر روک رکھا ہے کہ میں اس فیصلے کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤں گا۔

جیوری نے فیصلہ سنا دیا تھا سر آئزک کا چہرہ فیصلہ سننے کے بعد بھی اُترا ہی رہا۔۔۔۔۔ شاید انہیں آنے والے حالات کا کچھ اندازہ تھا۔ وہ یونیورسٹی میں صرف میری کلاس عارضی طور پر ختم کرنے کا انجام دیکھ چکے تھے۔ وہ جیوری کے ساتھ فیصلہ سنانے کے بعد بھی بہت دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

میں کمرے سے نکل آیا۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا کہ پیچھے سے موٹی توند والے پارکر نے مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ وہ میرے قریب پہنچ چکا تھا اُسے ہر لمحہ چیونگم چبانے کی عادت لگتی تھی۔ اُس نے غور سے مجھے دیکھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو تم ہو حماد۔۔۔۔۔ جس نے آج پورے لندن میں آگ لگا رکھی ہے۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ آگ لگانے کی قوت رکھتے ہو۔۔۔۔۔ میں جیوری کی تمام

اکا دکا واقعات کی وجہ سے کافی تشویش تھی جو لندن کی یہودی بستیوں کے مضافات میں ہوئے تھے۔ وہ مجھے خود یونیورسٹی کے گیٹ پر اپنی گاڑی سے اتار کر ہی واپس ریسنورنٹ گیا اور مجھے تاکید کر گیا کہ میں واپس پر نکلنے سے پہلے بھی اُسے فون کر کے بلوالوں اور پیدل، تنہا یونیورسٹی سے نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ بچپن سے ایسا ہی تھا، اسکول اور کالج میں جب کبھی میرا کسی سے جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ یونہی میرے سائے کی طرح میرے ساتھ چپکا رہتا تھا اور جب تک وہ خطرہ ٹل نہیں جاتا تھا مجھے کہیں اکیلے نہیں جانے دیتا تھا۔ یوں کئی مرتبہ ہم دونوں نے اکٹھے اور بہت مرتبہ اُس نے میری جگہ اکیلے اپنے جسم پر بہت سے زخم کھائے تھے۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایسے دوستوں کو ماں باپ کے ساتھ کا درجہ کیوں نہیں دیا جاتا؟

یونیورسٹی کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے ہیلو، ہائے، اور مبارک باد کی آوازیں نے میرا استقبال کیا۔ حالانکہ آج یونیورسٹی میں کل کی تقریب کی وجہ سے عام تعطیل کا اعلان کیا گیا تھا اس لیے یونیورسٹی تقریباً خالی ہی تھی۔ صرف ہوسٹل میں رہنے والے چند اسٹوڈنٹس موجود تھے لیکن مجھے اپنے خلاف ہونے والی انکوائری کے سلسلے میں آج بلایا گیا تھا۔ ڈین آئزک کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے کاندھے تھپک کر، ہاتھ ملا کر اور گلے لگا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

ڈین آئزک کے کمرے میں تو پوری عدالت ہی لگی ہوئی تھی۔ جیوری کے ممبر، پیٹر اور اس کے دونوں گواہ موجود تھے۔ ایک دو نئے چہرے بھی موجود تھے جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر آئزک کی آنکھیں سو جھمی ہوئی تھیں اور چہرہ اُترا ہوا تھا۔ یقیناً رات کو دو بجے جب سارہ کو ربیکا نے، میں نے اور ہمارے ساتھ کی تمام ٹولی نے گھر چھوڑا تھا تب اُس کے بعد ان کی اور سارہ کی ایک طوفانی بحث یا جھگڑا ضرور ہوا ہوگا۔ میری آج سارہ سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے میں صرف اپنے طور پر خیالی گھوڑے ہی دوڑا سکتا تھا کہ کل رات سارہ کے گھر میں کیا ہوا ہوگا۔

جیوری نے اپنی کارروائی شروع کی۔ میرے خلاف الزامات کی فہرست پڑھ کر سنائی گئی جس میں اب یونیورسٹی کی منفی شہرت کا سبب بننے کا الزام بھی شامل کیا جا چکا تھا۔ لیکن آج مجھے جیوری کی عجلت میں دکھائی دے رہی تھی۔ میرا تھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب خصوصی



سارے ثبوت موجود تھے۔ تم نہیں جانتے، تم نے اور تمہاری دوست سارہ نے اس وقت لندن کی تمام انتظامیہ اور سارے خفیہ ڈیپارٹمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ساری پولیس کو ممکنہ ری ایکشن کی وجہ سے الرٹ کر دیا گیا ہے۔ اگر یونیورسٹی انتظامیہ ہمیں طلب نہ کرتی تب بھی لندن انتظامیہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ معاملہ اب اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے۔“

”لیکن آپ یہ کیسے جانتے ہیں کہ ان کا الزام جھوٹا ہے۔“

”تیس سال سے پولیس کے محکمے کی خاک چاٹ رہا ہوں برخوردار۔۔۔ اس خبیث لائبریرین کی شکل پر ہی لکھا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اور میرا اندازہ ہے کہ یہ سب یونیورسٹی کے ڈین کی شہ پر ہو رہا ہے۔“

وہ واقعی پکا پولیس والا تھا۔ کچھ دیر میں ہی بات کی گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔

”اس کے بعد کا دوسرا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ ذہن میں ضرور رکھنا کہ ان لوگوں نے اب تمہیں لندن سے ڈی پورٹ (علاقہ بدر) کرنے کا پورا منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔ جو بھی قدم اٹھانا بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا۔“

”آپ مجھے یہ بتائیے کہ پیٹر کی شکایت پر میرے خلاف پولیس کا رد عمل کیا ہوگا۔“

پارک نے چونک کر میری طرف دیکھا۔۔۔

”میری توقع سے کہیں زیادہ ذہن ہو۔ عام حالات میں پولیس اس کی تمہارے خلاف شکایت پر زیادہ سے زیادہ یہ عمل کرتی کہ تمہیں چند منٹ کے لیے قریبی اسٹیشن بلوا کر تم سے کوئی زبانی یا تحریری ضمانت لے لیتی اور تم دونوں کو مستقبل میں محتاط رہنے کی تنبیہ کر کے جانے دیتی۔ کیونکہ پولیس کے محکمے میں اور کسی یونیورسٹی کے قانون میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پولیس بغیر کسی ثبوت کے صرف گواہوں کی شہادت پر کسی کو ملزم یا مجرم نہیں مان سکتی، اور گواہ بھی وہ خود الزام لگانے والے کے وفادار ملازم ہوں۔ لیکن اس دن کی تقریب اور تمہاری دوست کی اس تقریر کے بعد اب حالات وہ نہیں رہے۔ اب اس یہودی کا الزام ستر فیصد پہلے ہی درست مان لیا گیا ہے۔ لندن انتظامیہ بہت چوکنا ہو گئی ہے۔ رہی سہی کسر تشدد کے ان اکا دکا واقعات نے پوری کر دی ہے۔ ایسے موقع پر چاہے پولیس تمہارے خلاف کوئی ایکشن لے یا نہ لے۔ لیکن ساتھ وہ ہر حال میں تمہاری یونیورسٹی انتظامیہ کا ہی دے گی۔ اس

کارروائی کے دوران بہت غور سے تمہیں دیکھ رہا تھا، تمہارے چہرے پر ذرا سی بھی پریشانی نہیں تھی۔“

”میں جانتا تھا کہ یونیورسٹی انتظامیہ یہی فیصلہ کرے گی۔ فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔ آج صرف سنایا گیا ہے۔“

پارک چیونگم چباتے ہوئے اپنی ڈھیلی پینٹ کے گیلکس اوپر کھینچتے ہوئے بولا۔

”بہت خوب۔۔۔ مجھے تمہارا اعتماد واقعی بہت پسند آیا۔۔۔ کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ یونیورسٹی کے باقی اسٹوڈنٹس کو شہر کی سڑکوں پر لا کر جنوری کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دو گے۔ اگر ایسا ہے تو میں تمہیں اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ انتظامیہ نے کل سے یونیورسٹی کو پندرہ دن کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ اسٹوڈنٹس کے کسی ممکنہ ری ایکشن سے بچا جاسکے۔“

پارک نے خبر سنا کر پھر ماہر پولیس والوں کی طرح میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ حالانکہ وہ یہ سب نہایت غیر محسوس طریقے سے کر رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”آپ بے فکر رہیے۔ اس یونیورسٹی کی اسی سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسٹوڈنٹس کو دو ہفتے کی چھٹی بغیر کسی اطلاع کے مل رہی ہے۔ وہ سب اس چھٹی کو بہت خوشی سے پُر لطف انداز میں گزاریں گے۔“

میں آگے بڑھنے لگا۔ پارک نے جلدی سے پھر مجھے پکارا۔

”آگے کا کیا ارادہ ہے؟“

”ابھی کچھ سوچا نہیں۔ اپنے خلاف جھوٹے الزام کا سامنا کروں گا۔“ میں پھر آگے بڑھنے لگا۔ پارک پھر بولا۔

”میں جانتا ہوں کہ یہ الزام جھوٹا ہے۔“

میں رُک گیا۔ میں نے حیرت سے پارک کی جانب دیکھا۔ وہ حسب معمول چیونگم چباتا رہا۔ ”آپ جانتے ہیں پھر بھی آپ میرے خلاف ہوتی انکوائری کے دوران پُپ چاپ خاموش بیٹھ رہے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟؟؟“

”کیونکہ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور ان لوگوں کے پاس گواہ کے طور پر



پارکر نے تفصیل سے مجھے تمام صورت حال کا جائزہ کر کے بتا دیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اپنے آئندہ کسی بھی اقدام کے سلسلے میں آگاہ رکھوں گا۔ پارکر میرا کندھا تھپتھا کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ، ربیکا، جم وغیرہ میں سے کسی کو میری آج یہاں سر آئزک کے سامنے پیشی کا پتہ نہیں تھا ورنہ وہ سب کے سب اس وقت یہاں جمع ہوتے۔ میں نے دانستہ طور پر خود بھی انہیں اس اچانک کال کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں اس انکوائری کے نتیجے سے پہلے ہی سے بخوبی واقف تھا۔ بالآخر سر آئزک نے اپنا مقصد کسی نہ کسی طور حاصل کر ہی لیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے آگے آنے والے وقت اور حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ کامران کو میں نے فون کر کے یونیورسٹی کے فیصلے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ آج ہی دو چار اچھے وکیلوں سے اس سلسلے میں بات کر لے گا۔ آج سر آئزک اور ان کے درپردہ یہودیوں کے امرا طبقے نے میرے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا تھا مجھے میرے خیالات کی سزا دی جا رہی تھی۔ مجھے ان کی نئی نسل کو سوچ کے راستے پر ڈالنے کی سزا دی جا رہی تھی۔ یہ سزا دینے والے صرف سر آئزک ہی نہیں تھے، ان کا تو صرف ایک چہرہ تھا جو مجھے دکھائی دے رہا تھا یا ان کا نمک خوار پیئر۔۔۔ جس کا کاندھا ان لوگوں نے استعمال کیا تھا۔ اصل میں تو اس سازش کے پیچھے لندن کا ہر رنگ نظر اور رئیس یہودی شامل تھا جو دم تھا۔ ایک معمولی سے لڑکے کی جرأت پر ان سب کا تو خون ہی کھول اٹھا ہو گا جس نے وقت کے اس بہت سے بڑے سرمایہ دار طبقے سے ٹکر لینے کی جرأت کی تھی۔ وہ مجھے اب عبرت کی مثال بنا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ ایسی جرأت پھر دوبارہ اور کوئی نہ کر سکے۔ لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ سارہ کی زبانی میرا پیغام لندن کے گلی کوچوں میں پھیل چکا تھا اور اب یہ بات چل نکلی تھی۔ مجھے اس لمحے سارہ پر بے حد پیار آیا۔ کیا دنیا میں سچ کا دامن تھا منے والی ایسی متوالی لڑکی کوئی اور ہو سکتی ہے۔۔۔؟

شام تک سب سے پہلے سر آنرک کے ذریعے سارہ کو اور پھر سارہ کے ذریعے ربیکا،  
جم ڈیوڈ، ٹینا اور جانے کس کس تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ مجھے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔  
وہ سب کے سب کامران کے فلیٹ پر جمع ہونا چاہ رہے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ یہاں کچھ ہی  
ویر میں وہ ہلڑ بازی ہوگی کہ جگہ کم پڑ جائے گی۔ اس لیے میں نے ربیکا کو کہا کہ وہ ان سب کو  
لے کر کامران کے ریسٹورنٹ پہنچ جائے۔ لیکن سارہ نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا اور  
اُس نے مجھے گھر سے لے کر کامران کے ریسٹورنٹ جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ میں جانتا تھا کہ  
سارہ سے مزید بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے اس کی ذہنی حالت کا بھی اندازہ تھا۔  
لہذا میں پُچھ ہی رہا۔ میں اپنی سفید جین کے اوپر نیوی بلیو سویٹر گلے سے نیچے کھینچ ہی رہا تھا  
کہ سارہ کی گاڑی کا ہارن بج اُٹھا۔ جلدی سے جوتے پیروں میں ڈالے اور نیچے پہنچا تو سارہ  
پریشان سی اپنی سفید پٹیل سمیت موجود تھی۔ اس کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ روئی ہے۔ مجھے  
دیکھتے ہی اُس نے گہرے رنگ کا دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر لگا لیا حالانکہ دھوپ تو اب ڈھل  
چکی تھی۔ میں پُچھ چا پ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سڑک کے کونے پر اسپینیش گٹار بجانے والی  
لڑکی جینی ابھی تک موجود تھی۔ اُس نے مجھے شاید سارہ کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا  
اس لیے گاڑی جیسے ہی اس کے قریب پہنچی وہ جلدی سے آگے بڑھ آئی۔ اس کے ہاتھ میں  
گلاب کی دو کلیاں تھیں جو اُس نے مجھے اور سارہ کو پیش کر دیں اور مسکرا کر بولی۔

“فارسینورآ۔۔۔۔۔ماد۔۔۔۔۔”

میں نے مسکرا کر اس سے پھول لے لیا اور جیب سے اُسے چند روپے نکال کر دینے کے لیے آگے بڑھائے، لیکن اُس نے مسکرا کر میرا ہاتھ روک دیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلی میں بولی۔



”نہیں۔۔۔۔۔ یہ میری طرف سے ہے۔۔۔۔۔ آپ کے لیے بھی۔۔۔۔۔ اور مادام کے لیے بھی۔۔۔۔۔“ سارہ نے مسکرا کر اس کا شکر یہ ادا کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔  
 ”ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے چاہنے والوں کی گھنٹی پوری نہیں ہو پاتی۔۔۔۔۔ جہاں جاتے ہو اپنا جادو بکھیر دیتے ہو۔۔۔۔۔ اپنی گلی میں بھی کافی مقبول ہو۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔؟“  
 میں سارہ کی بات سن کر مسکرا دیا۔

”تم ساتھ ہونا۔۔۔۔۔ اس لیے لوگ خصوصی اہمیت دے رہے ہیں۔۔۔۔۔ یہ میرے نہیں۔۔۔۔۔ تمہارے جادو کا اثر ہے سارہ میڈم۔“

سارہ میری بات سن کر ہنس دی۔ اس کے چہرے پر چھایا غبار کچھ چھٹ سا گیا۔ ڈھلتی شام پھر سے روشن ہو گئی۔ سارہ نے رش کی وجہ سے گاڑی کی شہر کی مضافاتی سڑک کے راستے پر ڈال دیا۔ یہ راستہ درمیان شہر کی گلیوں والے راستے سے بہت لمبا تھا لیکن اس وقت دفاتروں سے چھٹی کی وجہ سے سڑکوں پر اس قدر ہجوم تھا کہ ہم اس شہر سے باہر والے راستے سے کہیں جلدی ٹریفک اسکوآر تک پہنچ جاتے جہاں سے تیسری سڑک کے بہت بڑے اور سڑک سے بھی چوڑے فٹ پاتھ کے کونے پر کامران کاریسٹورنٹ موجود تھا۔ اب ہماری گاڑی ٹیمز ریور کے پل سے گزر رہی تھی۔ دُور سورج کی آخری کرنیں پل کی بڑی بڑی برجیوں کی نوکیلی چوٹیوں کو چوم کر الوداع کہہ رہی تھیں۔ دریا میں پچھلے سونے کی لمبی لمبی سی تاریں تیر رہی تھیں۔ کار اس طویل پل کو پار کر کے اب پل کے ساتھ دوڑتی، بل کھاتی، کالی لمبی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سارہ نے کچھ دُور جا کر دریا کے کنارے گاڑی روک دی اور گاڑی سے نکل کر سڑک کی ڈھلان پر بنی لوہے کی اس لمبی سی پٹی کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی جو دریا کنارے سڑک کے ساتھ ساتھ دُور تک بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ سورج اب ڈوب چکا تھا لیکن شفق کی لالی اب آسمان پر نارنجی رنگ بکھیر رہی تھی۔ یہ نارنجی رنگ جب دریا کنارے پر ہی برف کی پٹی پر پڑتا تو مجھے اپنے محلے میں آنے والے گولے گندے دانے کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی تو ایسے ہی سفید برف کا گولا بنا کر اس کے اوپر شیشے کی بوتلوں میں بھری لالک، نیلی، پیلی اور نارنجی رنگ کی شربت انڈیل کر گولہ ہمارے حوالے کر دیتا تھا اور پھر ہم سب بچے دیر تک مزے لے لے کر وہ برف کا گولہ پُوستے رہتے تھے۔

سارہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی خاموش دریا کے بہتے پانی کو دیکھتی رہی۔ اس نے اب بھی اپنی آنکھوں سے وہ گہرے رنگ کا کالا چشمہ نہیں اتارتھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس چشمے کے نیچے اس کی گھنی پلکیں اب بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ پھر بالآخر اس نے خود ہی یہ خاموشی توڑی۔

”پاپا نے اچھا نہیں کیا۔۔۔۔۔ میں انہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی۔ انہوں نے میرا بھرم توڑ دیا ہے۔ وہ ایک کمزور شخص نکلے میڈی۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں بالکل ٹوٹ گئی ہوں۔“  
 بالآخر اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس نے اپنے اندر بائیس سالوں سے جس باپ کا بُت سب سے اُدنچی جگہ پر سجا کر رکھا ہوا تھا۔ شاید آج وہ بُت پاش پاش ہو گیا تھا۔ میں نے سارہ کی آنکھوں سے اس کا چشمہ اتار دیا۔۔۔۔۔ اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں سے اس کے بہتے آنسو صاف کیے اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیے۔

”تم دنیا کی سب سے مضبوط لڑکی ہو مس آئزک۔۔۔۔۔ تمہارے یہ بہتے آنسو تمہیں کمزور نہیں بنا سکتے۔ ابھی تمہیں زندگی میں ایسے اور بہت سے تجربات سے گزرنا ہوگا۔ اور اس وقت شاید میں یا تمہارے دوستوں میں سے بھی بہت سے تم سے دُور ہوں گے۔ اس لیے خود کو ابھی سے سنبھالو سارہ۔۔۔۔۔ میں تمہیں یوں کمزور پڑتے نہیں دیکھ سکتا۔  
 سارہ اب بھی سک رہی تھی۔

”نہیں حماد۔۔۔۔۔ میں اتنی طاقتور نہیں ہوں، مجھے اتنا بڑا مقام نہ دواپنی نظروں میں۔۔۔۔۔ اتنی بھاری ذمہ داری نہ ڈالو میرے کاندھوں پر۔۔۔۔۔ میں تو بہت کمزور لڑکی ہوں۔۔۔۔۔ نہیں نبھاپاؤں گی یہ سب کچھ۔۔۔۔۔ نہیں نبھاپاؤں گی۔“  
 ”تمہیں نبھانا ہوگا۔۔۔۔۔ تم ہی نبھاؤ گی۔۔۔۔۔ یہ میں جانتا ہوں۔“  
 میں نے زور سے سارہ کو کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”اور سر آئزک نے وہی کیا جو ایک جنگ میں کوئی دشمن دوسرے دشمن کے ساتھ کرتا ہے۔ ان سے کیسا گلہ۔۔۔۔۔؟ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ یقین جانو مجھے ان سے کوئی ذاتی شکایت نہیں ہے۔“



”نہیں۔۔۔ تمہارا دل تمہیں کبھی دھوکا نہیں دے گا۔۔۔ اتنی اچھی لڑکی کا دل کبھی دھوکے باز نہیں ہو سکتا۔“

میرا جواب سن کر وہ بھی مسکرا دی۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور پھر سارہ نے نہ جانے کن شارٹ کٹ راستوں سے گاڑی نکالی کہ ہم آدھے گھنٹے میں کامران کے ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ وہاں تو واقعی میلہ سالگا ہوا تھا۔ میری تقریباً پوری کلاس ہی موجود تھی اور چند دیگر مسسٹرز کے لڑکے لڑکیاں بھی وہاں رفتہ رفتہ پہنچ رہے تھے۔ کامران ریسٹورنٹ کے اندر اور باہر کافی مصروف نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں کو پہنچتے دیکھ کر وہیں دور سے چلایا۔

”مسٹر حماد امجد رضا۔۔۔ پانچ سو سینتیس پاؤنڈ کا بل بن چکا ہے۔ براہ مہربانی کاؤنٹر پر تشریف لے آئیے۔“

ربیکا نے فوراً اعلان کیا کہ وہ آج کا تمام بل خود دے گی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کامران کبھی اس سے بل کا ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ ہم سب ریسٹورنٹ کے باہر فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر ہی ٹک گئے۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور پندرہویں اسٹریٹ، جس پر کامران کا ریسٹورنٹ موجود تھا اب جگمگانے لگی تھی۔ کافی کی خوشبو آس پاس بکھرنے لگی تھی۔ جہاں دیدہ بوڑھے سگار سلگائے کبھی نہ سلجھنے والے مسئلوں پر بات کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر بنے ریسٹورانٹس میں لگی کرسیوں پر جمع ہو رہے تھے۔ جلتے سگاروں کی مہک سے سماں دھواں دھار ہونے لگا تھا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر دن کے چوبیس پہروں میں شام کا پہرہ نہ ہوتا تو ہماری زندگی کتنی بے رنگ ہوتی۔۔۔ ایک خوبصورت شام، دوستوں کا ساتھ چھلکتی خوشبوئیں۔۔۔ یہ سب کتنی بڑی نعمت ہیں۔۔۔ ہماری زندگی میں کیسی کیسی نعمتیں ہیں جن کا ہم شکر تو دور کی بات ہے ٹھیک سے کبھی احساس بھی نہیں کر پاتے۔۔۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ شاعروں نے دیوان کے دیوان صرف اس ایک شام پر کیوں لکھ مارے ہیں۔

میرے تمام کلاس فیلوز بے حد بھرے ہوئے تھے۔ جم کل صبح سے شہر کی مرکزی شاہراہوں پر مظاہرے کرنے کا شیڈول طے کر رہا تھا، ربیکا ایک میز پر چڑھی تقریر کر رہی تھی

سارہ چلا کر بول پڑی۔

”لیکن کیوں؟۔۔۔ ایسی کیا جنگ ہے ان کی تم سے۔۔۔؟ کیا دشمنی ہے۔۔۔؟ کیا ہے تمہارے پاس ایسا کہ سارا شہر تم سے خوف زدہ ہے۔۔۔ میں آج تک اپنے آپ کو اپنی نسل کو عظیم سمجھتی رہی لیکن تم نے ایک جھٹکے میں ہی ہماری عظمت کے تمام احساسات کو تار تار کر دیا۔۔۔ میں پاپا کو دنیا کا سب سے مضبوط آدمی سمجھتی تھی لیکن وہ تو سب سے زیادہ کمزور نکلتے۔۔۔ تم نے تو ہمیں صرف سچ کو کھوجنے کی دعوت دی تھی۔۔۔ وہ سچ کیا ہے جس سے میرا مضبوط باپ بھی کتراتا ہے۔۔۔ مجھے تو یہ معاملہ صرف ہالوکاسٹ تک کا نہیں لگتا۔۔۔ مجھے بتاؤ حماد۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ کس پر اعتبار کروں۔۔۔ مجھے لگتا ہے میں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔۔۔ میرے اندر میرے اپنے بنائے ہوئے آئیڈیلز ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے ہیں۔ میں اندر سے مر رہی ہوں۔۔۔ میرا اعتبار۔۔۔ میرا بھرم ٹوٹ رہا ہے۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔ کہاں جاؤں۔“

سارہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور اپنا درد کہتی رہی۔

”تم صرف اپنے دل پر اعتبار کرو۔۔۔ جو تمہارا دل کہے۔۔۔ وہی سچ ہے۔۔۔ کبھی کبھی فیصلہ دل پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔۔۔ اب چلو۔۔۔ وہاں ریسٹورنٹ میں سب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم جانتی ہو نا ربیکا کے دل پر کیسی چھریاں چل رہی ہوں گی اس وقت۔“

سارہ مسکرا دی میں جانتا تھا کہ کس بات سے اس کا موڈ بہتر ہو سکتا ہے اور یہی میں چاہتا تھا۔ میں نے اس کا سیاہ چشمہ اس کے بالوں میں سجا دیا۔ ہم دونوں دور اوپر سڑک کے کنارے کھڑی ہماری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ میں سارہ سے دو قدم آگے تھا۔ اچانک سارہ نے رک کر مجھے آواز دی۔

”ہے میڈی۔۔۔“

میں نے پلٹ کر سارہ کو دیکھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ دل ٹھیک فیصلہ کرے گا۔ مجھے کوئی دھوکا تو نہیں دے گا۔“ اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔



”یہ مسٹر پارکر ہیں۔ لندن کی خفیہ پولیس کے سیکشن انچارج۔۔۔ اور یہ مس سارہ آئزک ہیں۔ میری ہم جماعت۔“

”میں ان سے واقف ہوں۔ بلکہ آج کی تاریخ میں لندن کی پولیس اور انتظامیہ میں شاید ہی کوئی بد قسمت ایسا ہو جو مس آئزک سے واقف نہ ہو۔“

”آپ بے فکر رہیں مسٹر پارکر۔۔۔ میں اور سارہ اسی لیے یہاں آئے ہیں ان سب کو کسی بھی غلط قدم اٹھانے سے روک سکیں۔ لیکن آپ یہاں کیسے؟“

پارکر مسکرا دیا۔

”اب تو جہاں تم وہاں ہم۔۔۔ مجھے خصوصی طور پر تم پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تمہارے مداحوں کی تعداد دیکھ کر لگتا ہے کہ اوپر والوں کی پریشانی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔“

سارہ کے ہاتھ میں کافی کا کپ بہت دیر سے یونہی تھما ہوا تھا۔ کافی کی اٹھتی بھاپ کے عقب سے اس کی وہ دو گہری آنکھیں جانے کس سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔ پارکر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں مس آئزک۔۔۔ شاید اپنے دوست کے لیے۔“

سارہ نے چونک کر پارکر کو دیکھا۔

”حماد بے قصور ہے۔۔۔ اُسے نا کردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔“

پارکر نے دوسری پیسٹری منہ میں ڈالی۔

”انقلابی کا سب سے بڑا گناہ، انقلاب کی ترغیب ہی ہوتا ہے۔ پچھلے زمانوں میں ایسے گناہ گاروں کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ حاکم کے نزدیک لوگوں کی سوچ بدلنے سے بڑا گناہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور حماد بھی اسی جرم کا مجرم ہے۔“

”اگر حماد کا ٹرم پیپر کسی انقلاب کی ترغیب تھا تو میں بھی تو اس میں برابر کی شریک ہوں۔ میں نے بھی وہی گناہ کیا ہے۔ پھر مجھے کیوں سزا نہیں دی جا رہی۔۔۔؟“

”سزا تو آپ کو بھی دی جا رہی ہے مس پارکر۔۔۔ آپ کے دوست کو آپ سے دور کر کے۔۔۔ آپ کے چہرے پر یہ بے چینی، یہ ادا سی بلا وجہ تو نہیں ہو سکتی نا۔“

جانے پارکر نے یہ بات دانستہ کی تھی یا نادانستہ طور پر اس کے منہ سے یہ سچ نکل گیا تھا۔

کہ یونیورسٹی انتظامیہ نے مجھے بے دخل کرنے کے بعد یونیورسٹی صرف اس لیے بند کر دی ہے تاکہ ان کے جھوٹ پر پردہ پڑا رہے۔ آس پاس کے فٹ پاتھر ریسٹورانوں کی میزوں پر بیٹھے بوڑھے بھی اب ریکا کی تقریر دلچسپی سے سن رہے تھے اور عام اسٹوڈنٹس کے ساتھ گرجوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ تمام طالب علموں نے غیر معینہ مدت کے لیے یونیورسٹی سے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سارہ ان کو یہ سمجھانے میں لگی ہوئی تھی کہ انہیں جو بھی قدم اٹھانا ہے بہت سوچ سمجھ کر اور قانون کے دائرے میں رہ کر اٹھانا ہوگا تاکہ یونیورسٹی انتظامیہ کسی بات کا فائدہ نہ اٹھا سکے، لیکن اس وقت ان سب کے جذبات اس قدر بھرے ہوئے تھے کہ وہ سارہ کی بات بمشکل ہی سمجھ پا رہے تھے۔ ابھی یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ میں نے نیلی بتی چھت پر سجائے تین لمبی سفید کاروں کو پندرہ ویں گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ یقیناً یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں جن کی آواز والے سائرن بند کیے گئے تھے۔ گاڑیاں ریسٹوران سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئیں۔ اگلی گاڑی میں سے پارکر اپنی چٹلون کے گیس کھینچتا ہوا باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی دور سے ہی اُس نے گرجوشی سے ہاتھ ہلایا۔ دیگر لڑکے لڑکیوں نے کڑی نگاہوں سے ان سب سادہ وردی والے پولیس آفیسرز کو گھورا، اور لندن پولیس کے خلاف بھی نعرے بازی کی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو روکا۔ پارکر چیونگم چباتا ہوا میز پر قریب پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے اور سارہ سے ہاتھ ملایا، ہم تینوں ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ اسٹوڈنٹس پھر سے اپنے پُرانے مشغلے میں جٹ گئے۔ پارکر نے غور سے تمام طلباء اور ان کے جوش اور جذبے کو دیکھا۔

”ایک ہی دن میں یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔ اور مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ دونوں مرتبہ تم نے اپنے بے حد مضبوط ہونے کا مجھے احساس دلایا ہے۔ جس طرح سے تمہارے صرف ہاتھ کھڑے کرنے پر یہ سارا ہجوم چپ ہو گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقت پڑنے پر یہ تمہارے کہنے پر کسی دریا میں بھی بخوشی چھلانگ لگا دیں گے۔“

اتنے میں بیرا ہم سب کے لیے کافی کے کپ میز پر رکھ گیا۔ ساتھ ہی کچھ نمکین بسکٹ اور پیسٹریاں بھی تھیں۔ پارکر نے ایک پیسٹری اٹھا کر منہ میں رکھی۔ سارہ حیرت سے اس کی اور میری بے تکلفی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے سارہ کا تعارف کروایا۔



”آپ کے خیال میں ان کے اس غصے کا راستہ روکنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟“  
میں اسی طرف آ رہا تھا۔ قانونی طور پر تمھاری پوزیشن بہت مضبوط ہے کیونکہ تم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کا بہانہ لے کر تم پر ہاتھ ڈالا جاسکے۔ بلکہ لندن پولیس کے لیے تم باہر رہ کر اتنے خطرناک نہیں ہو جتنا اندر جا کر ہو جاؤ گے۔ کوئی بھی اچھا وکیل گرفتاری سے قبل بھی تمھاری ضمانت منظور کروا سکتا ہے۔ اس لیے ہم ان خطوط پر سوچ ہی نہیں رہے۔ لیکن میں اس وقت لندن انتظامیہ کی طرف سے تمھارے پاس ایک رضا کارانہ اپیل لے کر آیا ہوں۔  
”رضا کارانہ اپیل۔۔۔۔۔؟“ میں نے حیرت سے دھرایا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں انتظامیہ کی طرف سے تم سے یہ اپیل کرنے آیا ہوں کہ اس سے پہلے کہ یہ چنگاری فرقہ دارانہ فسادات کی شکل میں بھڑک اٹھے۔۔۔۔۔ تم کچھ عرصے کے لیے لندن چھوڑ دو۔ خود اپنی مرضی سے۔“  
میرے سر میں دھماکا سا ہوا۔

”لندن چھوڑ دوں۔۔۔۔۔؟ لیکن کیوں۔۔۔۔۔ اور اس سے فائدہ کیا ہوگا؟“  
”بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ بھڑکے ہوئے یہودیوں کو فساد کا کوئی بہانہ نہیں مل پائے گا۔ وہ تم کو ہی اصل خطرہ سمجھتے ہیں۔ تمھارے جانے کے بعد ان کے اندر کا خوف اور دشمنی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔۔۔۔۔ ویسے بھی یونیورسٹی نے تمھیں فی الحال واپس داخلے کی کوئی بھی سفارش رد کر دی ہے۔ تم اگر چاہو تو لندن سے باہر رہ کر بھی یونیورسٹی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہو۔ یہاں رہو گے تو تمھارے ساتھی طلباء دھیرے دھیرے بھڑک کر لندن کی سڑکوں پر آ جائیں گے اور اس کا نقصان دوسرے لوگوں کو ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ تمھارا مقصد طلباء کی طاقت کو منفی انداز میں استعمال کرنا نہیں ہے کیونکہ اگر تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کب کی یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا چکا ہوتا۔ لیکن میرا یقین کرو۔۔۔۔۔ تمھاری لندن میں موجودگی بہت سے بے گناہوں اور معصوم انسانوں کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میری بات پر غور کرنا۔۔۔۔۔ مجھے تمھارے جواب کا انتظار رہے گا۔“

پارکر مجھے گہری سوچ میں چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ سارہ بہت دیر سے ذور بیٹھی ہم دونوں کو بات کرتا دیکھ رہی تھی۔ پارکر کے جاتے ہی وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور پوچھنے لگی

سارہ پھر وہاں بیٹھ نہیں پائی کیونکہ شاید وہ اپنی اندرونی حالت پارکر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ معذرت کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد پارکر نے میری جانب دیکھا۔

”تم بہت خوش قسمت ہو مسٹر حماد۔۔۔۔۔ تمھیں سارہ جیسی دوست کا ساتھ ملا ہے۔۔۔۔۔ ملاوٹ اور بے ایمانی کی اس دنیا میں ایسے سچے رشتے اور سچے جذبے کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میں تمھیں یہ بتانے آیا تھا کہ پیٹر نے باقاعدہ تحریری طور پر تمھارے خلاف درخواست جمع کر دادی ہے۔ لیکن میں نے چیف کو یقین دلایا ہے کہ صبح تم سے ملاقات کے بعد میرے تم سے متعلق تمام خدشات دور ہو گئے ہیں لہذا تمھیں باقاعدہ بلوا کر تم سے جواب لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہماری اطلاع کے مطابق لندن کے مضافات میں اور قرب وجوار کی یہودی بستیوں میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ یہودی تمھاری یہاں موجودگی کو اپنی نئی نسل کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ان کے ایک خاص نمائندے آئزک کی بیٹی بھی تمھارے ساتھ وفاداری کا بھرم رکھنے والوں میں سب سے آگے کھڑی ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک بڑا چیلنج اور بڑی تضحیک کی بات ہے۔ فی الحال لندن انتظامیہ نے معاملات کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ یہودی طبقہ تشدد اور توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار کر کے اس معاملے کو بگاڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ سارہ کے تمھارے ساتھ ہونے کی وجہ سے شاید وہ براہ راست تو تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے آس پاس تمھاری نسل کے مزدور اور عام محنت کش طبقے کے نقصان کا بے حد خطرہ ہے۔ وہ ان غریب لوگوں پر اپنی بھڑاس اس رات کی طرح آسانی سے نکال سکتے ہیں۔“

مجھے پارکر کی بات نے بے حد پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ میری وجہ سے کوئی دوسرا غریب مسلمان سزا کیوں بھگتے۔ پارکر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ انہوں نے سارہ کی تقریر والی شام بھی اخبارات نکلنے کے بعد رات کو اکا دکا علاقوں میں وہاں کے رہائشی مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی اور چند جگہوں پر تشدد بھی کیا گیا تھا۔ یہ آگ دھیرے دھیرے مزید بھڑک بھی سکتی تھی۔ لندن انتظامیہ اور پولیس کی تشویش بے جا نہ تھی۔ میں نے پارکر سے ہی سوال کیا۔



کہ کیا معاملہ تھا۔ میں نے پارکر کی تمام بات ”الف“ سے لے کر ”ی“ تک اسے سنا دی۔  
سارہ نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ جو بھی ہوگا ہم سب مل کر اس کا سامنا کریں گے۔ میں جانتا تھا اس وقت سارہ کو کچھ بھی سمجھانا بہت مشکل ہوگا۔ اس لیے میں چپ رہا، وہاں ربیکا بار بار ایک میز پر جڑھی میرا نام پکار رہی تھی کہ میں آ کر اپنے ”زریں خیالات“ کا اظہار کروں، میں نے ان سب کے درمیان جا کر انہیں بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ کیا کہ فی الحال ہمارے پاس قانون اور عدالت کا راستہ موجود ہے اور کھلا ہے لہذا اس وقت احتجاج کو موخر کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ جب میں نے ان سب سے کہا کہ میرے لیے یونیورسٹی کی ڈگری سے کہیں زیادہ اہم ان سب کی دوستی ہے۔ محبت ہے جو مجھے آج حاصل ہے تو سب ہی افسردہ ہو گئے۔ ربیکا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے دم کو خصوصی طور پر علیحدگی میں لے جا کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس سے وعدہ لیا کہ وہ خود کو بھی اور اپنے ساتھ تمام دوسروں کو بھی قابو میں رکھے گا۔ جم کو سمجھانا واقعی ایک مشکل کام تھا لیکن جب میں نے اسے پارکر کی بتائی ہوئی ساری باتیں کہیں اور اسے سمجھایا کہ ہمارے اس احتجاج اور میڈیا پبلیٹی کو ہماری مخالف پارٹی معصوم لوگوں پر تشدد کرنے کے خلاف استعمال کرے گی تو اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ عجیب جذباتی نوجوان تھا یہ جم بھی۔ اسے دیکھ کر اور اس سے مل کر مجھے ہمیشہ عباد کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی ایسا ہی تھا، سر پھرا سا، دوستوں کی خاطر سب کچھ لٹا دینے والا۔ جاتے ہوئے جم نے بہت دیر تک مجھے گلے لگائے رکھا، سب ہی فرداً فرداً مجھ سے رخصت ہوئے۔ ربیکا نے جاتے ہوئے سارہ کے کان میں مجھے دیکھ کر کیا کہا کہ سارہ ہنس پڑی۔ ربیکا بھی ہم سے رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے اس نے اچانک میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر میرے ماتھے کو چوم لیا، اور نرم پلکوں کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کسی انسان کی معراج اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی انسان اسے ٹوٹ کر چاہے۔ اپنے دن اور رات اس کے نام کر دے۔۔۔۔۔ آج مجھے ایک لمحے میں ہی خدائی کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔۔۔۔۔ جب ایک انسان کا پیار آپ کو اس احساس سے دو چار کر سکتا ہے تو ازل سے لے کر اب تک آنے والوں انسانوں کی بندگی کا احساس کیا ہوتا ہوگا۔ آج میں نے جانا تھا کہ

خدا کو بندگی اس قدر پسند کیوں ہے۔

واپسی پر میں نے آتے ہوئے گاڑی میں سارہ سے پوچھا کہ ربیکا نے اسے جاتے ہوئے کان میں کیا کہا تھا۔ سارہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔  
”کہہ رہی تھی یہاں سے سیدھے گھر بی میڈی کو ڈراپ کرنا۔۔۔۔۔ کہیں گھومنے نہ نکل جانا۔“

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

”پھر تم نے کیا کہا۔“

”میں نے اس سے کہا کہ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ ایسا موقع ہاتھ سے جانے دوں۔“ ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ سارہ نے ہائیڈ پارک سے دائیں کو مڑنے والی چوڑی سڑک پر گاڑی موڑ لی۔ دُور پکا ڈلی سرکس کے بڑے بڑے جھولوں کی روشنیاں جھللاتی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے سارہ کی طرف دیکھا۔  
سارہ مسکرائی۔

”رات کے دس بجے ایک اچھی میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم سفر کو گھر چھوڑنے سے پہلے رات کے کھانے کا ضرور پوچھے۔ یہاں میری پسند کا ایک ریستوران ہے کیا تم میرے ساتھ وہاں ڈنر کرنا پسند کر دو گے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ ضرور لیکن اس شرط پر کہ بل میں ادا کروں گا۔ دراصل آتے ہوئے میں کامران کا ہونہ اٹھا کر لے آیا تھا۔ اسی طرح واپس کر دوں گا تو اس کے دل کو بہت ٹھیس لگے گی۔“

سارہ ہنس دی اور گاڑی ایک لمبا سا موڑ کاٹ کر دھیمی روشنیوں والے اس ریستورنٹ کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ سارہ کی پسند کبھی عام ہو نہیں سکتی تھی۔ مجھے ہال میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ نہایت نفاست سے دُور دُور لگی ہوئی مدہم روشنیوں سے جگمگاتی میزوں والے اس طویل و عریض ہال میں جس کے ایک جانب لکڑی کا بہت بڑا سا فرش (ڈانس فلور) اور باز بھی موجود تھا۔ عام لوگ نہیں آتے ہوں گے۔ سارہ کو وہاں کا عملہ شاید اچھی طرح جانتا تھا۔ تبھی انہوں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا ہر تپاک استقبال کیا اور سبھی مس



دامن بچارہا ہوں۔ لیکن سچ یہی ہے کہ میرے اندر آج اگر تمہیں کوئی بھی خوبی نظر آتی ہے۔۔۔۔۔ میری ذات میری شخصیت۔۔۔۔۔ میری باتوں میں کوئی خوبصورتی نظر آتی ہے تو اس کی وجہ میں نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ ایمان ہے۔۔۔۔۔ اس کے بخشنے ہوئے پیار کا احساس ہے، پیارا انسان کو پیارا بنادیتا ہے سارہ۔۔۔۔۔ اس کے اندر سے تمام بُرائیاں نکال دیتا ہے۔۔۔۔۔ محبت انسان کے لہجے کا زہر پُوس لیتی ہے۔۔۔۔۔ اس کی باتوں میں مصری گھول دیتی ہے۔۔۔۔۔ آنکھوں سے شہد ٹپکا دیتی ہے۔۔۔۔۔ محبت انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔۔۔۔۔ پری زاد بنادیتی ہے۔“

سارہ غور سے میری طرف دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ میری باتیں جیسے اپنی آنکھوں سے سُن رہی ہو۔۔۔۔۔ جذب کر رہی ہو۔۔۔۔۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”شاید میں بھی انسان نہیں رہی حماد۔۔۔۔۔ شاید میں بھی پری زاد بنتی جا رہی ہوں۔“  
میں نے چونک کر سارہ کو دیکھا، اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور پلکوں کی شبیم گر کر سارے ماحول پر اُوس کی بارش کرنے والی تھی۔

”ہاں حماد۔۔۔۔۔ میں نے خود پر بے حد قابو پانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ بہت روکا خود کو۔۔۔۔۔ بہت لڑی ہوں خود سے۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی خود کو روک نہیں پائی۔۔۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے حماد۔۔۔۔۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی محبت کا یہ میٹھا زہر چکھ لیا ہے حماد۔۔۔۔۔ پورا پیالہ حلق سے نیچے اندیل لیا ہے حماد۔۔۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔۔۔ بہت بے بس ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔ بہت لاچار ہو گئی ہوں میں۔۔۔۔۔“

اس لمحے میرے سارے لفظ ہی جیسے کہیں گم ہو گئے تھے۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کچھ بول ہی نہیں پایا۔ سارہ کی آنکھوں سے دو موتی گرے اور میز پر رکھی گلاب کی اک پنکھڑی پر پڑ گئے۔ وہ بڑی ہمت کر کے پھر بولی۔ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

”میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے دل کے اندر صرف اک خوش نصیب کا ہی بسیرا ہے۔ وہ جو تمہاری روح کی گہرائیوں تک تمہارے اندر بسی ہوئی ہے۔ تم نے کبھی کسی سے یہ راز نہیں چھپایا کہ ایمان کی محبت تمہارے خون کے ذروں میں شامل ہے۔ کتنی سچی ہے تمہاری محبت۔۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود میرا دل کیوں نہیں مانتا حماد۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ کیوں

آنزک کہتے کہتے تھک نہیں رہے تھے۔ سارہ نے ہال کی ایک جانب لگی خوبصورت سی میز بیٹھنے کے لیے پسند کی۔ ہال میں ہلکے سُروں میں میرے لڑکپن کا پسندیدہ گانا ”پچھلے کر مس میں نے تمہیں اپنا دل دے بیٹھا تھا“ کی دھن بج رہی تھی۔ چند جوڑے فلور پر ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے محبوب کے شانوں پر سر رکھے جھوم رہے تھے۔ مغربی موسیقی اگر ہلکے سُروں میں ہو تو کبھی کبھی مشرقی موسیقی سے بھی زیادہ کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ جانے کیوں مجھے چیخنے چنگھاڑتے گانے اور موسیقی کبھی بھی نہیں بھائی تھی۔ ہماری میز پر رکھی دو شمعیں روشن کر دی گئی تھیں اور اُن کی لو میں سارہ کا کندن رنگ مزید دکنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر بال بکھر بکھر سے جاتے جنہیں وہ پھر سے سنوارنے کی ٹیک دود سے تھک سی گئی تھی۔ بے خیالی میں اس کی مجھ پر نظر پڑی تو اپنی اس معصوم سی حرکت پر خود ہی مسکرا دی۔ اس کی ستارہ آنکھیں بار بار نم ہونے کی کوشش کرتی لیکن وہ بڑی صفائی سے اُس نمی کا راستہ روک لیتی تھی۔ بہت دیر تک ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر میں نے ہی خاموشی کو توڑا۔

”ایک اچھی میزبان کا فرض صرف کھانا کھلانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اچھی اچھی باتیں کر کے اپنے ہم راہی کا دل بہلانا بھی ہوتا ہے مس سارہ آنزک۔“  
”تم ہی کچھ بولو نا۔۔۔۔۔ میں تم جیسی باتیں کہاں کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔ مجھے تو صرف تمہیں سننا اچھا لگتا ہے۔ تمہارے ہونٹوں سے سُنی ہوئی ہر بات نئی لگتی ہے، خوبصورت لگتی ہے۔“

”یہ میری باتوں کا نہیں۔۔۔۔۔ تمہاری خوبصورت سماعت کا احساس ہے جو تمہیں میری عام سی باتیں بھی شاعری میں ڈھلی لگتی ہیں۔“  
”تم کبھی کسی بات کا بھی کریڈٹ کیوں نہیں لینا چاہتے۔۔۔۔۔ اقرار کر لینا دل کو بہت سی نئی الجھنوں سے بچا دیتا ہے۔ کیا سمجھے مسٹر میڈی۔۔۔۔۔؟۔ مان لینا ہی سکون کا باعث ہوتا ہے۔“

آج سارہ کے لہجے میں کوئی نئی بات تھی۔۔۔۔۔ کچھ نیا پن تھا۔۔۔۔۔  
”نہیں۔۔۔۔۔ میں اقرار سے بچ نہیں رہا۔۔۔۔۔ نہ ہی کسی بات کا کریڈٹ لینے سے



سمیٹ رہی تھی۔ اپنی عمر کی نقدی میں جمع کر رہی تھی کہ زندگی گزارنے کے لیے عمر کی نقدی میں ایسا ایک پل بھی بہت ہوتا ہے۔ تمام عمر خرچ کرتے رہو، عمر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس پل کی پونجی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں نے دھیرے سے سارہ سے پوچھا۔

”مجھے بتاؤ۔۔۔ تمہارے اس درد کو ختم کرنے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری زندگی، میری ساری عمر پر تمہارا حق ہے۔ تم جو چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔“

سارہ دھیمے سے مسکرائی۔

”کاش محبت کا، دانا نہ ہونا بھی ہمارے بس میں ہوتا۔ کاش میرے پاس وقت کو پلٹنے کی طاقت ہوتی تو میں تمہیں تمہاری پہلی محبت سے پہلے ملنے کی کوشش کرتی۔ کاش جو عظمت تمہارے دل میں مجھ سے پہلے ایمان کی ہے۔ اس کی سب سے پہلی حق دار میں ہوتی۔ کاش میری محبت میں یہ ”کاش“ نام کا کوئی لفظ ہی نہ ہوتا۔ لیکن اس محبت کا المیہ ہی یہی ہے کہ اس کی ابتدا ہی کاش سے ہوتی ہے۔ تم میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ تم نے اپنی پوری زندگی پر مجھے اختیار دے دیا ہے۔ اس سے زیادہ بڑی نعمت، اس سے زیادہ بڑی مہربانی اور انجام کیا ہو گا۔ میری اس ایک زندگی کے لیے تو تمہارا یہ اقرار ہی کافی ہے۔ بس ایک وعدہ کرو مجھ سے، میں جانتی ہوں ایمان کی یاد تمہارے دل سے تابا نہیں مٹ پائے گی۔ لیکن جب کبھی تم کسی اور کو اپنی اس ابدی محبت کا حصے دار بنانا چاہو گے، تو میرا حق سب سے پہلے ہو گا۔ وعدہ کرو مجھ سے حماد۔۔۔ مجھے میرے ہونے کا بھرم دے دو، میرے وجود کی تصدیق کر دو۔“

میں نے سارہ کی نازک انگلیاں اپنی ہتھیلی میں تھام لیں۔

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

سارہ نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں اپنی بند آنکھوں کے پوٹوں پر بہت دیر تک جوڑے رکھا، جیسے کسی سیجائی کی تاثیر کو اپنی بند آنکھوں سے اپنے پورے جسم میں، اپنی روح میں دھیرے دھیرے پکڑ رہی ہو، سیراب کر رہی ہو۔

سازندوں نے جارج مائیکل کا نغمہ چھیڑا۔

”اوپر واہ سرگوشیاں

میری سب سے اچھی دوست ہیں۔۔۔“

میں اس دل کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہو گئی ہوں کہ خود میرا مجھ پر، میرے دن رات پر، میری روح پر اختیار نہیں رہا۔۔۔۔۔ میرے لفظ میرے نہیں رہے۔ میری ساری شخصیت میری نہیں رہی۔۔۔ اس محبت نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے حماد۔۔۔ اس سے کہو مجھے میرا آپ واپس لوٹا دے۔۔۔۔۔ میری سانسیں مجھے واپس سوپ دے۔“

میں سارہ کی حالت سمجھ سکتا تھا۔ لفظ اس کے ہونٹوں سے اپنے آپ ہی پھلتے جا رہے تھے۔ یہ سارہ نہیں۔۔۔۔۔ سارہ کے اندر کی لڑکی بول رہی تھی۔ سارہ تو بہت خاموش بہت کم گو لڑکی تھی۔ یہ تو پھر اسی محبت کا ایک اور تازیانہ تھا جواب اس معصوم لڑکی کی روح کو کچھ کے لگا رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ محبت کے اس صحرا کی پیاس کب بجھے گی اور کتنے بے بسوں کی، لاچاروں کی روح کو اپنی ریت میں جذب کرے گا یہ صحرا؟ ازل سے انسانوں کے دلوں کے ساتھ یہ کھیل کھیل رہی ہے محبت۔ جانے کتنے جوان دل اس کی پیاس کی بھینٹ چڑھ چکے ہوں گے اب تک۔۔۔؟ لیکن اس کی حرص پھر بھی نہیں مٹی۔ اب بھی ہر لمحہ ہر گھڑی کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں کسی کی محبت میں مبتلا ہو رہا ہوتا ہے۔ بس کی طرح تڑپ رہا ہوتا ہے اور محبت دور کھڑی ان روح نکلتے دلوں کی یہ تڑپ اور یہ بے بسی دیکھتی رہی ہے۔

میں سارہ سے کچھ نہ کہہ پایا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ بس میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ وہ میز کی دوسری جانب یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ جلتی شمعوں کی روشنی میں اس کی بھیگی آنکھیں جگمگاتی رہیں۔ ہال میں بیٹھے سازندوں نے اسٹیو ونڈر کا نغمہ چھیڑ ”ہیلو۔۔۔۔۔ کیا تم میری ہی راہ دیکھ رہے ہو۔“

میں تمہاری آنکھوں میں دیکھ سکتا ہوں

میں تمہاری مسکراہٹ میں کھوج سکتا ہوں

کہ تم تنہا ہو۔۔۔۔۔

اور کہیں کوئی تمہاری محبت میں مبتلا ہو رہا ہے۔“

اس نغمے کی دھن پر رقص کرتے جوڑوں کے قدم دھیرے دھیرے تھرک رہے تھے۔

پورے ہال کی مدھم رشتی میں دل کو چھو جانے والی محبت کا راج تھا۔ خوشبو تھی، رنگ تھے اور نور تھا۔ سارہ چپ چاپ بیٹھی میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسی ایک پل کو جی رہی تھی۔



پل پل میں کیسے کرشمے دکھاتی ہے، کیسے کیسے روپ بدلتی ہے۔

گھر واپسی پر ہم دونوں خاموش تھے۔ آج سارہ کو میری طرف سے اُسی بھرم کی ضرورت تھی جو اُس رات چرچ سے واپسی پر مجھے سارہ کی جانب سے درکار تھا۔

محبت اپنے اظہار کے پل جس قدر بے باک ہوتی ہے۔ وہ پل گزر جانے کے بعد اس سے کئی گنا زیادہ شرمیلی ہو جاتی ہے۔ سارہ کا بھی اس وقت وہی حال تھا۔ ہماری گاڑی لندن کی سنان سڑکوں سے ہوتی ہوئی کامران کے فلیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔

سارہ کے گلے کا سکارف بار بار لہرا رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میں نے دانستہ اُسے خل نہیں کیا۔ کبھی کبھی ہمیں کسی کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ گاڑی کامران کے پارٹمنٹ کے نیچے آ کر رک گئی۔ سارہ نے میری جانب دیکھے بغیر کہا۔

”آج کی رات میری زندگی کی سب سے حسین رات تھی حماد۔۔۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔“ میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ ہوٹل سے نکلتے ہوئے ہال کے دروازے پر کھڑے دربان نے ہمیں گلاب کی ایک ایک کلی پیش کی تھی جو ہوٹل کے خوبصورت مونوگرام والے کپڑے کے چھوٹے سے رومال میں لپیٹی ہوئی تھیں۔ گاڑی سے اترتے ہوئے میری کلی وہیں اندر ڈیش بورڈ پر پڑی رہ گئی تھی۔ سارہ نے گاڑی میں لگا قلم نکال کر اس رومال پر دن، تاریخ اور وقت لکھ کر اُسے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

”میں اُسے نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھ رہی ہوں۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔“

”گھر پہنچ کر مجھے ایک فون ضرور کر دینا، رات کافی بیت چکی ہے اور شہر میں تمہارے مذاہن کی تعداد بھی کافی ہے۔“

سارہ نے سر بلایا۔ میں گاڑی سے دو قدم پیچھے بنا تا کہ وہ گاڑی آگے بڑھا سکے۔ سارہ نے اپنے گلے سے لپٹا۔ سکارف کھولا اور گاڑی سے نیچے اتر کر اُسے میرے گلے میں باندھ دیا۔

”یہ تمہارے ساتھ رہے گا تو ہمیشہ میری یاد دلائے گا۔“

سارہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور اس نے کار آگے بڑھائی۔ میں اُسے گلی کے موڑ سے

سارہ نے جیسے اپنی آخری خواہش ظاہر کی۔

”میرے ساتھ ایک بار رقص کرو گے۔۔۔؟“

سارہ کے معصوم انداز پر میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہم دونوں اٹھ کر لکڑی کے گول فرش کی جانب بڑھ گئے۔ سارہ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اُس کا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر کھڑے نغمے کی دھن پر اپنے قدم فرش پر رکھتے رہے۔ سازندوں کے سربراہ نے جو ایک لمبا نیگرو تھا، اپنا ہیٹ اتار کر مجھے سلام پیش کیا۔ اور مجھے اشارہ کیا کہ اب جو نغمہ وہ اور اس کا گروپ مل کر بجائیں گے وہ صرف میرے اور سارہ کے لیے ہوگا۔ پھر لمبے نیگرو نے اپنے ساتھیوں کو کچھ اشارہ کیا اور نغمے کی دھن بدل گئی۔

(بیک اسٹریٹ بوائز) ایک مشہور بینڈ کا نغمہ گونجا۔

”یہ صرف لفظ ہی تو ہیں

جو میرے پاس ہیں، صرف لفظ۔۔۔۔

جن سے میں تمہارا دل

چرائے جا رہا ہوں۔“

ہم دونوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ڈانس فلور پر گھومتی ہوئی گول روشنی صرف مجھ پر اور سارہ پر آ کر رک گئی تھی اور آس پاس کے سبھی رقص کرتے جوڑے لکڑی کے گول فرش کے دائرے میں کناروں پر کھڑے جانے کب سے صرف مجھے اور سارہ کو ہی دیکھ رہے تھے، سارہ کے رقص کا انداز بھی اسی کی طرح باوقار تھا۔ اس کے قدم عجلت میں نہیں اٹھتے تھے جیسے بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھنے کی جگہ کا انتخاب کر رہی ہو۔ نغمے کی دھن ختم ہونے کے بعد جب آس پاس سے تالیوں کا شور اٹھا تو ہم نے دیکھا کہ پورا ہال ہماری طرف ہی متوجہ ہے اور صرف ہم ہی روشنی کے گول دائرے میں کھڑے ہیں۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر بے اختیار ہنس دی۔ اس کی ہنسی سے لگا جیسے تیز بارش کے دوران کالی گھٹا ایک دم چھٹ گئی ہو اور آسمان پر بادلوں کے درمیان سے اچانک سورج نکل آیا ہو۔ سب لوگ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ سارہ کے چہرے پر چھایا غبار بھی شفق کی میٹھی سُرخی میں بدل چکا تھا۔ یہ محبت بھی



## الوداع

اگلے دو دن بہت ہی ہنگامہ خیز گزرے۔ جم کے بے حد کنٹرول کرنے کے باوجود چند اسٹوڈنٹس نے اچانک یونیورسٹی بند کرنے پر خوب ہنگامہ آرائی کی۔ ایک جلوس تو باقاعدہ سر آئزک اور جیوری کے خلاف نکالا گیا۔ اخبارات نے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور یہودیوں کے زیر اثر اخبارات نے تو سیاہ پروپیگنڈہ کی حد ہی کر دی۔ ان اخبارات نے میرے ٹرم پیپر کو یہودیوں کی مقدس تاریخ پر ایک حملہ قرار دیا۔ اور ان اخبارات کی ہرزہ سرائیوں کی وجہ سے تشدد کے واقعات میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا۔

پارکر اس دوران مسلسل مجھ سے رابطے میں رہا اور لگاتار اپنی رضا کارانہ پیش کش کے بارے میں میرا جواب جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دن بھی میں اور کامران شام کو اکٹھے ہی تھے جب اس کا اپارٹمنٹ کے نمبر پر فون آیا تھا۔

”ٹھیک ہے مسٹر پارکر۔۔۔۔ میں لندن چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرے چلے جانے سے تشدد کی یہ لہر واقعی ختم جائے گی۔“

”مجھے پورا یقین ہے، ان کی اصل دشمنی تم سے ہے۔ یہ مزدور طبقہ بے چارہ ان کا کیا بگاڑ پائے گا۔ اور پھر میڈیا میں ان کا تاثر بھی ان واقعات کی وجہ سے بُری طرح خراب ہو رہا ہے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد ان کے پاس کوئی وجہ نہیں رہ جائے گی لڑنے کی۔“

”ٹھیک ہے سر۔۔۔ میں تین دن بعد کی پہلی فلائٹ سے لندن چھوڑ دوں گا۔ آپ چاہیں تو اخبارات اور میڈیا کے ذریعے اس خبر کو ابھی سے شہر میں پھیلا دیں۔ میں اب ان کے ہاتھوں مزید کسی بے گناہ کا نقصان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

دوسری جانب سے کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر پارکر کے گہرے سے سانس لینے کی آواز ابھری۔

مڑتے وقت تک دیکھتا رہا۔ ٹھنڈی تیخ بختہ ہواؤں نے میرے وجود کو جھنجھنا دیا اور میرے گلے میں بندھا سارہ کا سکارف لہراتا رہا۔ یہ صرف ایک سکارف ہی نہیں تھا۔ یہ سارہ کے وجود کی خوشبو تھی۔ جو میرے گلے سے سکارف کی صورت میں لپٹی ہوئی تھی اور تمام ماحول پر دھیرے دھیرے چھا رہی تھی۔ ذور کسی گھنٹہ گھرنے رات کے سنائے میں دو بجنے کا اعلان کیا۔ میں شکستہ قدموں سے اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔



”یہ مذاق کی بات نہیں ہے مسٹر میڈی۔۔۔۔۔ تم پر ہمارا بھی کچھ حق ہے اور میں اسی حق کا سہارا لے کر کہتی ہوں کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“

سارہ پُپ چاپ کھڑی تھی کیونکہ اُسے میرے فیصلے کی وجہ معلوم تھی۔ اس دن پارکر سے ہوئی تمام گفتگو اور پھر شہر کے واقعات پر شروع سے ہی اُس کی نظر تھی۔ لیکن اس کے انداز سے بھی صاف ظاہر تھا کہ اُسے میرے فیصلے سے سب جانتے ہوئے بھی بے حد دھچکا لگا ہے۔ ہم سب اس وقت کامران کے ریسٹوران کے باہر والے فٹ پاتھ پر لگی میزوں پر ہی بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں جم، ڈیوڈ اور ٹینا وغیرہ بھی آ گئے۔ میں نے ان سب کے جذبات کو بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ انہیں اپنے لندن چھوڑنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی کہا کہ میں ہمیشہ کے لیے واپس نہیں جا رہا۔ ان سب سے رشتہ میرے خون میں شامل ہو چکا ہے اور اب چاہے میں دنیا کے کسی کونے میں بھی رہوں۔ میرا دل ان سب کے ساتھ ہی دھڑکے گا۔

ربیکا کے آنسو بار بار چھلک جاتے تھے۔ میں نے ماحول کو کچھ بدلنے کے لیے ربیکا پر چوٹ کی کہ کچھ لوگ دوستوں کو صرف نمکین آنسوؤں کے گلاس پر ہی ٹر خا کر رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے اعزاز میں کوئی الوداعی تقریب ہی منعقد کر دیں۔ ربیکا بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی اور اُس نے ہم سب کو اپنی پوری کلاس کو اگلے دن اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیا۔ ان کا دل رکھنے کے لیے میں نے وہیں سے ان کے سامنے ہی فون پر اپنے دکلا کو چند ہدایات دیں کہ میرا کیس کس طرح سے عدالت میں پیش کرنا ہوگا۔ سارہ اس تمام دوران بالکل گم صم سی اور خاموش بیٹھی رہی۔ جانے اس کے ذہن میں کیا کشمکش سی چل رہی تھی۔

رات گئے وہ سب مجھ سے رخصت ہو گئے، سارہ بھی اپنی سفید پٹیل کی جانب بڑھ گئی۔ میں آج کامران کے ساتھ آیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ واپسی کا ارادہ بھی تھا۔ سارہ کے قدموں کی ہچکچاہٹ واضح تھی۔ کامران جو میرے ساتھ ہی میز پر بیٹھا تھا اُس نے خود ہی سارہ کی مشکل آسان کر دی اور سارہ سے چلا کر کہنے لگا۔

”مس آنزک۔۔۔۔۔ اگر آپ میرے حال پر رحم کریں اور میرے اس جذباتی

”میں جانتا تھا تم آخر کار یہی فیصلہ کرو گے۔ میں نے صرف اپنے اسی یقین پر ابھی تک لندن پولیس کو تمہارے خلاف کسی غلط الزام پر کوئی جھوٹی کارروائی کرنے سے روک رکھا تھا۔ حالانکہ مجھے اس کے لیے بہت سے ایسے لوگوں کی بھی سننا پڑی جن سے عام حالات میں بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ تم واقعی ایک بہادر لڑکے ہو۔ یہ لوگ تمہیں تو یہاں نکلنے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن جو نظریہ تم بیج کی صورت میں ان کی نئی نسل کے دماغ میں بو گئے ہو۔ وہ اس نظریے کو کبھی اپنی آنے والی نسلوں کے دماغ سے نہیں نکال پائیں گے۔۔۔۔۔ ہمیشہ خوش رہو۔“

پارکر نے فون رکھ دیا۔ کامران نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔

”تو کیا واقعی تم نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابھی سارے راستے بند نہیں ہوئے میڈی۔ میں نے شہر کے بہترین وکیلوں سے بات کی ہے۔ ہم آخری وقت تک ان سے لڑیں گے۔“

”میں نے قانونی لڑائی سے ہاتھ کب روکے ہیں یا۔ وہ جنگ تو تم یہاں میری غیر موجودگی میں بھی ضرور لڑو گے۔ لیکن فی الحال میرا منظر سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔ میری وجہ سے بہت سے معصوم لوگ مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ ان کا میرا ہم مذہب ہونا ہی سب سے بڑا جرم بن گیا ہے۔“

کامران کا غصہ اپنی جگہ بجا تھا اور پھر شام تک ٹی۔ وی اور اخبارات کے ذریعے میرے سبھی دوستوں کو بھی میرے اس فیصلے کی خبر ہو گئی۔ سب سے پہلے سارہ اور ربیکا پہنچیں۔ ربیکا نے تو آتے ہی آسمان سر پر اٹھالیا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔۔۔۔۔ تم نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔ ہم تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے۔ اس روز ایئر پورٹ جانے والے تمام راستوں کا گھیراؤ کریں گے۔ سڑکوں پر لیٹ جائیں گے۔“

”تم کوئی اچھی سی صاف سڑک دیکھ کر ایٹنا۔۔۔۔۔ درنہ صبح جو تم تین چار گھنٹے اپنے میک اپ پر لگاتی ہو وہ سب ضائع ہو جائیں گے۔“

ربیکا غصے میں بھی ہنس پڑی۔ لیکن پھر دوبارہ چلا کر بولی۔



سارہ پُپ رہی۔ جیسے کوئی گبری سوچ اس کے اندر جنگ چھیڑے ہوئے ہو پھر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں بہت دنوں سے وہ وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہوں جس نے اتنے بہت سے لوگوں کو تم سے خوفزدہ کر رکھا ہے۔ لیکن ہر بار میری سوچ خالی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آئی ہے۔ میں نے توریت اور انجیل میں بھی کافی سرکھپایا لیکن تمہارے پیغام تک نہیں پہنچ پائی۔ وہ کیا بات ہے جو تمہیں ہم سب میں ممتاز کرتی ہے۔ خصوصی بناتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو تمہارے اندر فخر اور غرور کا اس قدر مضبوط احساس جگاتی ہے کہ میرے پاپا جیسے مضبوط اور بڑے قدر والے انسان بھی تمہارے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ ایسے سازشی بونے جو ایک دراز قدر شہزادے کو سینکڑوں کی تعداد میں مل کر گرانے کی اور اس کی مشکلیں کسے کی فکر میں ہوں۔ لیکن ہر بار منہ کی کھار ہے ہوں۔ بولو۔۔۔ تم میں ایسا کیا ہے میڈی؟“

”سچ کہوں تو مجھ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے فخر کرنے کے لیے۔ ہاں اگر میرا مذہب ہی ان کی پریشانی کی وجہ ہے تو یہ مذہب تو میرے سب ہم مذہبوں کا غرور ہے۔ میں نے تو آج تک اس مذہب کا ایک حق بھی ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا۔ سچ پوچھو تو میں اپنے مذہب کے نام پر خود ایک دھبہ ہوں۔ میرا کوئی بھی تو عمل اس سے مطابقت نہیں رکھتا، اور ایک بات اور جو تم خود جانتی ہو کہ میں تو ایمان کی وجہ سے ہمیشہ اس مذہب کو اپنا مخالف۔۔۔ اپنا دشمن سمجھتا رہا ہوں۔۔۔ میں یہاں آنے تک یہی سمجھتا رہا کہ اس مذہب نے ہی مولوی علیم کی صورت میں میری ایمان کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ یہ مذہب مجھے دوسروں میں اتنا ممتاز کر دے گا۔ میرا قدر اتنا بڑھا دے گا۔ دشمنوں اور میرے مخالفوں کو مجھ سے اتنا خوف زدہ کر دے گا۔ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تو کبھی اس مذہب کو اپنے لیے باعث افتخار نہیں سمجھا۔ ان سب لوگوں کی مخالفت نے اسے میرے لیے باعث افتخار بنا دیا۔“

”سچ کہوں تو یہاں آنے سے پہلے میں ”ہالوکاسٹ“ کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ نہ ہی میرے دل میں کبھی کسی فلسطینی مسلمان کے لیے کوئی درد ہی جاگا تھا۔ اور شاید اگر میرے راستے میں یہاں اس قدر کانٹوں کے جال نہ بچھائے جاتے تو میں کبھی اس ٹرم پیپر کی تحقیق میں نہ پڑتا۔ میں بھی عام نوجوانوں کی طرح اسے ایک واقعہ سمجھتا رہتا جس کے سچ یا جھوٹ کو

دوست کو گھر چھوڑتی جائیں تو میں اپنا کچھ کام دھندہ کر لوں۔ اس کے باپ کے پاس تو اسے ورثے میں دینے کے لیے کافی دولت ہے جب کہ میرا باپ میرے لیے صرف دعائیں چھوڑ گیا ہے۔“ سارہ کا مران کی بات سن کر مسکرا دی۔

”میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔“

کامران نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”جاؤ بیٹے حماد۔۔۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔۔۔ کیسے جان و جگر قسم کے دوست سے پالا پڑا تھا۔ حالانکہ میں جانتا ہوں وہ گاڑی کے قریب کھڑا میرا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن میں نے تمہیں یہ چانس بخش دیا ہے۔ جاؤ عیش کرو۔“

میں نے بھی اٹھتے ہوئے کامران کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

”بلی کے خواب میں چھپ چھپڑے۔۔۔“

کامران کا منہ بن گیا میں آ کر سارہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سارہ میری اور کامران کی نوک جھونک دور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”تمہارا دوست کیا کہہ رہا تھا میڈی۔“

میں نے سارہ کو کامران کی بات بتائی۔ وہ سن کر مسکرا دی۔

”تمہارا دوست واقعی دوستی کے قابل ہے۔ میں واقعی اکیلے آتے ہوئے ہچکچا رہی تھی لیکن جانے کیوں تمہیں ساتھ چلنے کا بھی نہیں کہہ پارہی تھی۔ کامران نے میری مشکل حل کر دی۔۔۔ تم نے اتنے بہت سے اچھے لوگ اپنے آس پاس کیسے جمع کر رکھے ہیں؟ ہمیں تو ڈھونڈنے سے بھی ایک نہیں ملتا۔“

میں سارہ کا اشارہ سمجھ کر مسکرا دیا۔

”جس کے گرد یہ سب لوگ جمع ہیں۔ وہ تو خود تمہارے ساتھ ہے۔ پھر یہ گلہ کیا؟“

سارہ بھی میرا جواب سن کر مسکرا دی۔ لیکن پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر اُداسی کے وہی۔

پرانے بادل چھا گئے۔

”تو تم جارہے ہو ہاں۔۔۔ ہم سب کو تنہا چھوڑ کر۔“

”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی تو ہوں۔ ہر لمحہ تمہاری دسترس میں۔“



میں نے سورۃ رحمن کھولی اور سارہ کو پڑھ پڑھ کر اس کا ترجمہ سنانے لگا۔  
 ”تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔۔۔۔۔“

میں پڑھتا گیا اور سارہ غور سے سنتی گئی۔ پھر جب میری نظریں انھیں تو میں یہ دیکھ کر  
 دنگ رہ گیا کہ دلوں پر لگا زنگ آنسوؤں کی صورت میں زار و قطار بہہ رہا تھا۔ میں خود بھی  
 اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک لمحے میں ہی جانے کتنے چہرے میری آنکھوں کے  
 سامنے سے گزر گئے۔ مولوی علیم، ریلوے اسٹیشن پر ملنے والے صوفی رحمت اللہ، عبد اللہ اور  
 جانے کون کون۔ جو اس دنیا میں اپنی آمد کا حق ادا کر رہے تھے۔ اور میں۔۔۔۔۔ میں تو اپنے  
 جینے کا ٹھیک سے شکر بھی ادا نہیں کر پایا تھا کبھی۔ ہماری اس دنیا میں آمد کا مقصد کیا تھا۔۔۔  
 اور ہم اپنی زندگی کن مشاغل میں بسر کرتے رہتے ہیں۔ روز اک نیا دھبہ اپنے پہلے ہی سے  
 بے تحاشا داغ دار دامن پر سجا لیتے ہیں۔ پھر بھی کتنے بے خبر کتنے خوش رہتے ہیں۔ واپسی پر  
 سارا راستہ اس کی آنکھیں بھیگی رہیں اور میں بھی خاموش رہا۔۔۔۔۔ رات کو جب سارہ نے  
 مجھے کامران کے فلیٹ پر ڈراپ کیا تو وہ بے انتہا رونے کے بعد اب پُر سکون تھی میں نہیں  
 جانتا تھا کبھی کبھی الوداع کہنا کس قدر مشکل ثابت ہوتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس رات سارہ  
 سے پھڑپھڑتے ہوئے ہوا۔ سارہ چلی گئی لیکن میں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اک  
 عجیب سی بے چینی میرے رگ و پے میں سامنے لگی تھی۔

جاننے کی زحمت بھی کبھی گوارا نہ کرتا، مجھے اس راہ پر ڈالنے والے بھی اصل میں سر آڑک ہی  
 ہیں۔ اگر میرے اندر کوئی جذبہ قابل فخر، قابل غرور ہے تو اسے جگانے میں سب سے بڑا ہاتھ  
 بھی انہی کا ہے۔ لیکن وہ مزید کس سچ سے خوف زدہ ہیں یہ تو میں بھی نہیں جان پایا ابھی  
 تک۔“

”اسی سچ اسی پیغام کی تو میں بھی متلاشی ہوں۔ کیا تم اس کھوج میں میری مدد نہیں کرو  
 گے حماد۔۔۔۔۔“

میں غور سے سارہ کی بات سن رہا تھا۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔؟ ایسا کون سا  
 پیغام ہو سکتا ہے۔ اس وقت شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی الوداعی کرنیں اونچی اونچی عمارتوں  
 کی چوٹیوں اور گنبدوں پر سنہری قلعی پھیر کر واپس پلٹنے کی فکر میں تھی۔ اچانک ایک اونچے گنبد  
 کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ہم اس سنٹرل لندن کے علاقے سے گزر رہے  
 تھے جہاں ایشیائی باشندوں کی بہت بڑی تعداد رہائش پذیر تھی۔ میں نے سارہ کو گاڑی سڑک  
 کے کنارے پر لگانے کا کہا۔ ہم دونوں گاڑی سے اتر آئے، سامنے ہی وہ عمارت موجود تھی  
 جس کے گنبد پر چمکتی سنہری دھوپ نے میرے دماغ کی کھڑکی بھی روشن کر دی تھی۔ یہ سنٹرل  
 لندن کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”شاید میں تمہیں اس پیغام کا کچھ حصہ ابھی اسی وقت پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ لیکن اس  
 کے لیے ہمیں اس عمارت میں جانا ہوگا اور اس عمارت میں داخلے کے کچھ آداب ہیں۔ اگر تم  
 میرے ساتھ ان آداب کو دھرا سکو تو۔۔۔۔۔؟“

سارہ چپ چاپ میرے پیچھے چل پڑی۔ مسجد کے صحن میں ہی بہت سے گرم ٹھنڈے  
 پانی کے ٹل لگے ہوئے تھے۔ سارہ نے میری طرف دیکھ دیکھ کر پانی اپنے ہاتھوں پر چہرے پر  
 اور کہنیوں پر بہایا۔ اور وضو کر کے مسجد کے صحن میں ہی ایک جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔ میں  
 انڈر سے قرآن اٹھا لیا۔ شاید ہمارے مولوی صاحب نے جب تیرہ برس کی عمر میں مجھے ختم  
 قرآن کی مبارک باد دی تھی۔ اس کے بعد آج میں نے اس کتاب کو تھاما تھا۔ ہاں البتہ جب  
 مولوی علیم، سنی کو درس دینے کے لیے ہمارے گھر آتے تھے تو میں اپنے مطلب کے لیے ان  
 کے آس پاس بیٹھا رہتا تھا اور یوں میرے کانوں میں ان کے مخصوص جے اور تلفظ گو بختا رہتا



آنے سے پہلے سارہ کے گھر سے ضرور ہوتا آئے۔ لیکن اس نے بھی آکر یہی بتایا کہ سارہ کی کوئی خبر نہیں ہے۔

آخر خدا خدا کر کے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ سب ہی نے مجھے فردا فردا جاتے ہوئے گلے لگا کر اپنی پوری حمایت اور سہارے کا یقین دلایا۔ جم، ڈیوڈ اور ٹینا تو رد ہی پڑے۔ کیسے عجیب رشتے تھے یہ۔ میں ان سب کا کچھ بھی نہیں تھا لیکن آج وہ سب میرے، سب سے زیادہ اپنے تھے۔ میرے ساتھ طوفان میں جم کر کھڑے تھے۔ آندھیوں کا زرخ موڑنے کی ہمت رکھتے تھے۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ جنگیں جذبے سے جیتی جاتی ہیں ایسے جان نثار ساتھ ہوں تو کسی کو کیا غم۔ سب نے مجھے یقین دلایا کہ میں بہت جلد پھر سے ان کے درمیان ہوں گا۔ سب ہی میرے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آئے تھے۔ ان سب کے خلوص کو دیکھ کر جانے کیوں میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ یہ دل کا پیانا بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ سارے جہاں کی نفرت سبہ جاتا ہے لیکن چند اپنوں کی محبت پا کر چھلک اٹھتا ہے۔ سب ہی لوگوں نے ربیکا کا اس شاندار پارٹی دینے پر شکر یہ ادا کیا۔ واقعی ربیکا نے کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا محل نما مکان آج پوری طرح سے سجا ہوا تھا۔ ہر طرف باوردی بہرے باتھوں میں مشروبات کی ٹرے تھامے سرشام ہی ہال میں ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ کھانے پینے اور موسیقی کا ایسا شاندار انتظام نہیں نے کم ہی کہیں دیکھا تھا۔ ربیکا نے ہال کے باہر موجود سوسنگ پول کے کنارے پر باربی کیو اور سازندوں کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ سارا ہال اور باہر پول کی جانب روشنیوں کا سیلاب تھا۔ خوشبوئیں تھیں، قہقہے تھے۔ لیکن سارہ کی غیر موجودگی نے سب ہی رنگ پھیکے کر دیے تھے۔ جم وغیرہ بھی جاتے وقت تک سارہ ہی کے بارے میں پوچھتے رہے۔

آخر کار ہال میں صرف میں ربیکا اور کامران رہ گئے۔ کامران کو میں نے دوبارہ سارہ کی خبر لینے کے لیے بھیجنے کا سوچا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ اب تک تو اُسے گھر واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہم ابھی یہ بات کر رہے تھے کہ سارہ کے خاص نوکر نے جو اس پارٹی کا چیف بلٹر بھی تھا، آکر ہمیں ہال میں خبر دی کہ کوئی مسٹر آنر آئے ہیں اور ربیکا سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ مسٹر آنر اس وقت آدھی رات کو

## تجدید ایمان

اگلی شام ربیکا کی پارٹی پر اس کے گھر سبھی دوست موجود تھے۔ میری ساری کلاس موجود تھی، سوائے سارہ کے۔ ربیکا نے ہر وہ جگہ جہاں سارہ کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ رابطہ کر کے دیکھ لیا تھا لیکن سارہ کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اس کے سارے فون نمبر بھی آزما لیے گئے لیکن سب بے سود رہا۔ ربیکا نے کئی مرتبہ سارہ کے گھر بھی فون کیا لیکن گھر پر کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک پُرانے نوکر نے جو ربیکا کو اچھی طرح جانتا تھا صرف اتنا بتایا کہ سارہ میڈیم کاسر آنرک کے ساتھ آج صبح بہت جھگڑا ہوا اور پھر نہ جانے وہ کہاں چلی گئیں۔ نوکر نے یہ بھی بتایا کہ سارہ کی ماما بھی اسی کی تلاش میں دن کو گھر سے نکل گئی تھیں اور ابھی تک واپس نہیں لوٹیں۔ سر آنرک کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ سرشام ہی اپنے دفتر چلے گئے تھے اور اب بھی یونیورسٹی میں ہی موجود ہیں۔

ربیکا نے پریشانی سے یہ ساری اطلاعات مجھے پارٹی ہال کے ایک کونے میں لے جا کر بتائیں۔ واقعی بات تو فکر کی تھی۔ میں بھی پریشان ہو گیا۔ آخر سارہ اس طرح سب کو بنا بتائے کہاں جاسکتی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر میں وہ یہاں آ ہی جائے۔ میں اور ربیکا اسی امید پر گھڑیاں گنتے رہے۔ ہم دونوں ہی اس پارٹی کو چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے تھے۔ ربیکا اس دعوت کی میزبان تھی اور میں وہ تھا جس کے اعزاز میں یہ سب لوگ یہاں جمع ہوئے تھے۔ لیکن ہم دونوں ہی کا من اب اس محفل میں نہیں لگ رہا تھا۔ میری ساری کلاس میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہاں جمع ہوئی تھی۔ دوسرے سمسٹرز سے بھی بہت سے لڑکے لڑکیاں تھیں۔ ربیکا کی شہرت اور دوستی یونیورسٹی کے کونے کونے میں بکھری ہوئی تھی۔ ہم دونوں درمیانی وقفوں میں بھی سارہ کی تلاش میں نمبر گھماتے رہے۔ کامران جو ریسٹوران میں تھا اور بعد میں یہاں پارٹی میں ہماری طرف آنے والا تھا اُسے میں نے فون کر کے خصوصی تاکید کی کہ وہ یہاں



حوالے کر دی لیکن پھر اُس سے بھی نہیں رہا گیا۔ وہ سارہ کی بچپن کی دوست تھی اور بہت سی ایسی جگہوں سے واقف تھیں جن کے بارے میں میں بھی نہیں جانتا تھا۔ ہم دونوں گاڑی نکال کر لندن کی سنان سڑکوں پر سارہ کو ڈھونڈنے نکل گئے۔ سب سے پہلے ربیکا نے سارہ کا اسکول اور پھر کالج کا رخ کیا لیکن دونوں جگہوں پر ہمیں مایوسی ہوئی۔ اب میری بے چینی اور پریشانی اپنی حدوں کو چھونے لگی تھی۔ میں نے اپنے دل میں گڑگڑا کر خدا کو پکارا۔ ہاں۔۔۔ اسی خدا کو جسے میں ایمان کی موت کے بعد سے بالکل ہی بھول چکا تھا۔ وہی خدا جس سے میں دل میں ناراض تھا۔ جس کو میں ایمان کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اسی خدا سے میں نے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ یا خدا اس معصوم لڑکی کی حفاظت کرنا۔ ہم سب زندگی میں چند مرتبہ ہی خدا کو سچے دل سے یاد کرتے ہیں اور پورے خلوص سے اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ اس رات میری دعا کا وہ لمحہ بھی شاید انہی چند سچے لمحوں میں سے ایک تھا۔ ابھی میں نے دل ہی دل میں دعا ختم ہی کی تھی کہ میرا موبائل فون بج اٹھا۔ فون کی اسکرین پر سارہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے فون آن کیا۔

”کہاں ہو تم۔۔۔۔۔ تمہیں کچھ احساس ہے کہ ہم سب کس قدر پریشان ہیں تمہارے لیے۔۔۔۔۔ آدھی رات کو میں اور ربیکا لندن کی سڑکوں پر تمہاری تلاش میں گاڑی دوڑا رہے ہیں۔ کوئی ایسا بھی کرتا ہے کیا۔۔۔۔۔؟“

میں نے چند لمحوں میں ہی اپنی ساری پریشانی غصے کی صورت میں سارہ پر نکال دی۔ وہ چپ چاپ میری بات سنتی رہی۔

”میں جانتی ہوں میرے اس رویے سے تمہیں اور باقی سب کو کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی۔۔۔۔۔ لیکن میں مجبور تھی۔ زندگی بدلنے والے چند فیصلے ایسے ہوتے ہیں جنہیں کرنے کے لیے انسان کو تنہا ہی سب کچھ جھیلنا ہوتا ہے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ میں جو پتہ تمہیں بتا رہی ہوں۔ تم ربیکا کے ساتھ ابھی اسی وقت وہاں چلے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

سارہ نے پتہ بتا کر فون کاٹ دیا۔ جو جگہ اُس نے بتائی تھی وہاں ہم دونوں پہلے بھی جا چکے تھے لیکن اس وقت اس جگہ کا نام سنتے ہی میرا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ جیسے چند لمحوں میں اچھل کر باہر نکل جائے گا۔ بڑی شکل سے میں نے ظاہری طور پر اپنی کیفیت پر قابو پایا

وہ ربیکا کے گھر کیا لینے آئے تھے۔ ربیکا نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا کہا۔ ہم تینوں نے تشویش سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میری اور سر آئزک کی نظر ایک دوسرے پر پڑی لیکن انہوں نے جلدی سے ربیکا سے پوچھا۔

”اس وقت آنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل سارہ ابھی تک گھر واپس نہیں آئی۔ میں نے سوچا شاید وہ یہاں ہو۔۔۔۔۔ اُس کا فون بھی بندل رہا ہے۔“

ربیکا نے سر آئزک کو بتایا کہ ہم خود سارہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور شام سے اس کی تلاش میں ہیں۔ اور اس وقت بھی دوبارہ اس کی تلاش میں نکلنے کی تیاری کر رہے تھے کہ آپ آگئے۔

سر آئزک نے ربیکا سے درخواست کی کہ اگر سارہ کے بارے میں کوئی خبر ملے تو انہیں ضرور خبر کرے۔ ربیکا نے سر ہلایا۔

سر آئزک پھر وہاں نہیں رُکے۔ انہوں نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ راستے میں ہال سے نکلتے ہوئے ان کی مجھ سے چند لمحوں کی مد بھیڑ ہوئی۔ انہوں نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا ان کی آنکھوں میں شدید نفرت تھی۔

”میں تم کو اپنی بیٹی چھیننے نہیں دوں گا۔ آخری جیت میری ہی ہوگی۔“

”میرا مقصد کبھی آپ سے آپ کی بیٹی کو چھیننا نہیں تھا۔ آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے اُسے کھو دیا ہے۔ البتہ ہم اُسے ڈھونڈ لیں گے۔ اور آخری جیت کا فیصلہ اگر ہم آخری جنگ پر ہی چھوڑ دیں تو بہتر ہوگا ورنہ لوگ کہیں گے کہ ایک شاگرد اپنے استاد کے راستے میں حائل ہو گیا۔“

سر آئزک نے مجھ پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور وہاں سے باہر نکل گئے۔ میں نے کامران سے کہا کہ وہ مشرق کی جانب سارہ کو ممکنہ جگہوں پر تلاش کرے جب کہ میں نے مغرب کی جانب ان جگہوں کو نوٹ کرنے کا ارادہ کیا جو سارہ آتے جاتے مجھے اپنی پسندیدہ بتاتی رہی تھی۔ میرے دل میں عجیب عجیب سے دسو سے جنم لے رہے تھے۔ اس شہر میں اس وقت سارہ کے درپردہ دشمنوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کامران چلا گیا۔ ربیکا نے گاڑی کی چابی میرے



”میں نے سچائی کا پیغام سن لیا ہے حماد۔۔۔۔۔ اب میرا راستہ بہت صاف ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں برتری اور احساسِ فخر کی کھوج میں ہوں۔ آج میری کھوج مکمل ہو گئی ہے۔ تمہاری بدولت مجھے اپنی وہ منزل نظر آ گئی ہے جو آگ کے دریا کے پار ہمیشہ سے موجود تھی لیکن میری نظروں سے اوجھل رہی۔ اب میں نے اس آگ کے دریا کو پار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور میری عظیم ماں نے بھی مجھے اس کی اجازت دے دی ہے۔ میرے ساتھ کھڑے ہو کر میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ماما اپنی وفا، اپنی مجبوریوں کی وجہ سے میرے ساتھ اس دریا کے پار نہیں چل سکتیں۔ لیکن میرے لیے ان کا تمہارا، ربیکا کا ساتھ ہی بہت ہے۔“

ربیکا پتہ پتہ نظروں سے سارہ کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اذان ختم ہو گئی تھی۔ سارہ نے میرا اور ربیکا کا ہاتھ تھاما۔

”چلو۔۔۔۔۔ سچ کے راستے پر چلنے میں دیر کیسی۔۔۔۔۔؟“

ہم سب خواب کے سے عالم میں مسجد میں داخل ہو گئے۔ وہاں پیش امام جو شاید انگریزی نثر ادبی تھا اور جس کے چہرے کے گرد نور کا ایک عجیب سا ہالہ تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہم سب کا استقبال کیا۔ شاید سارہ پہلے ہی انہیں سب بتا چکی تھی۔ اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے مولوی غلام الدین کی یاد آ گئی۔ کیا سبھی اللہ والوں کی شکلیں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے ہم سب کو عزت کے ساتھ بڑے گنبد کے نیچے بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے چند دعائیں پڑھیں اور پھر سارہ سے کہا کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے پہلا کلمہ ڈھرائے۔

”نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔۔۔۔۔“

کبوتروں کی ایک ڈار جو غول کی صورت میں محن میں دانا چک رہی تھی۔ ایک تیز آواز کے ساتھ فضا میں اڑی جیسے انہوں نے سارہ کو سلامی پیش کی ہو۔ پھر فضا ساکت ہو گئی۔ پھر دوسرا کلمہ، پھر تیسرا۔۔۔۔۔ چوتھا، پانچواں، چھٹا۔۔۔۔۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب میں نے اپنے مطلب کے لیے اور مولوی غلام کی قربت حاصل کرنے کے لیے یہ سارے چھ کے چھ کلمے یاد کیے تھے۔ مجھے لگا جیسے اس انگریزی نثر ادبی غور۔ پیش امام کی جگہ مولوی غلام ہمارے سامنے بیٹھے ہوں۔ ساتھ ہی دیکھا تو عبد اللہ بھی

اور ربیکا کو گاڑی موڑ کر سارہ کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف چلنے کو کہا۔ حیرت ربیکا کے چہرے سے بھی عیاں تھی لیکن میری حالت کے پیشِ نظر وہ چپ ہی رہی۔ کچھ ہی دیر میں ہم سنٹرل لندن کے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ ہمیں سارہ کی سفید بٹل دُور ہی سے اندھیری سڑک کے کنارے کھڑی نظر آ گئی۔ سارہ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چھوٹی سی پلپٹا پر کھڑی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا ”فرکوٹ“ پہن رکھا تھا جس کے کالر اُس نے سردی سے بچنے کے لیے اوپر اٹھا رکھے تھے، دور سے ہمیں سارہ کے کوئی اور بھی کھڑا نظر آیا۔ ربیکا نے گاڑی سڑک کی دوسری جانب روکی اور ہم دونوں اتر کر تیزی سے سارہ کی طرف لپکے۔ سارہ کے ساتھ اس کی ماما کو کھڑے دیکھ کر ہمیں حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ ربیکا جاتے ہی سارہ سے لپٹ گئی۔ سارہ نے تھپک تھپک کر اُسے تسلی دی اور بولی۔

”میں اس طرح تم سب کو پریشان کرنے کی معذرت چاہتی ہوں۔ ماما کو بھی میں نے آدھی رات کو ڈسٹرب کیا ہے لیکن میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“

مسز آئزک کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ بیٹی کے ساتھ مل کر بہت دیر تک روتی رہی ہیں اور جو بھی طوفان تھا وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی گزر چکا تھا۔ اب ان دونوں کے چہروں پر سکون ہی سکون تھا۔ مسز آئزک نے سارہ کے گالوں کو پیار سے تھپکا اور مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں کچھ حیران سا ان کی جانب بڑھ گیا اور انہوں نے پیار سے مجھے سینے سے لگالیا۔ میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کر کے انہیں سنوارا اور بولیں۔

”تم ایک سچے اور پیارے لڑکے ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی نے ایک سچے اور بہادر انسان سے دوستی کی ہے۔ میری دُمائیں ہمیشہ سارہ کے اور تمہارے ساتھ ہیں۔“

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سارہ کی جانب دیکھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار یا پونے پانچ بجے کا وقت ہوگا۔ اچانک فضا میں اک ارتعاش سا بکھرا اور موزن کی اذان گونجی۔

”اللہ بڑا ہے۔۔۔۔۔ اللہ بڑا ہے۔۔۔۔۔“

مجھے سارہ نے سنٹرل لندن کی اسی بڑی جامع مسجد کے سامنے بلایا تھا جہاں ایک دن پہلے میں اور سارہ آئے تھے اور ہم دونوں کے دلوں پر لگا کچھ زنگ ڈھلا تھا۔ سارہ میری حیرت دیکھ کر مسکرائی۔



نہ ہو۔“

سارہ نے خوشی سے لرزتی آواز کے ساتھ کہا۔

”میں اس نام کو اپنے لیے اعزاز سمجھتی ہوں۔“

امام صاحب نے دعا کی اور پرانی سارہ اور نئی ایمان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ربیکا نے بھی جلدی سے اپنا سر آگے کر دیا۔ امام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ پھر اس نے ربیکا اور میرے سر پر بھی ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ کالی رات کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اور یہ صبح بھی کسی عجیب صبح تھی۔ اتنا سفید اجالا میں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دودھیا سفید اجالا۔

ہم سب مسجد سے باہر نکل آئے۔ ایمان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ہم اپنی گاڑیوں کے قریب پہنچے۔ لندن کی مخصوص صبح کی دھند نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بمشکل ہمیں قریب کھڑی سفید بیل نظر آئی۔ ایمان نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا اور مسکرائی۔

”میں نہیں جانتی کہ میں کبھی تمہاری محبت پاسکوں گی یا نہیں۔۔۔ لیکن دیکھو۔۔۔ میں نے تمہارے خدا کو پالیا ہے۔“

میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے ماتھے کا بوسہ لیا اور مسز آئزک کے ہاتھ میں ایمان کا نازک ہاتھ تھمایا۔

”یہ میری زندگی کی سب سے قیمتی امانت ہے جسے میں آپ کے ہاتھوں میں سونپ رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھیے گا۔“

مسز آئزک مسکرائیں۔

”بے فکر رہو لڑکے۔۔۔ تمہاری امانت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اُسے نقصان

پہنچانے والی کسی بھی چیز کو پہلے میرے جسم اور میری روح کے پار ہونا پڑے گا۔“

ربیکا نے آگے بڑھ کر ایمان کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر وہ بھی اس کا ماتھا چوم کر بولی۔ ”آج تم سب سے جیت نہ ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میں تمہاری دوست ہوں۔“

میں جانتا تھا کہ ایمان۔۔۔ راتے میں آگے کیسے کیسے پُر خار راستے، کیسی کیسی الجھنیں

بیٹھا مسکا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر ربیکا کی جانب دیکھا تو وہاں بھی صوفی رحمت اللہ ہنستے ہوئے نظر آئے جیسے کہہ رہے ہوں ”میاں۔۔۔۔۔ ہم تو مسجد کی کھڑکی سے صرف باہر جھانکتے ہی رہے۔ تم نے تو اسے کھڑکی سے اندر مسجد میں ہی بلا لیا۔“

سارہ نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ اس کی دیکھا دیکھی ربیکا نے بھی گلے میں پڑا اسکارف اپنے سر پہ ڈال لیا تھا اور مؤدب بیٹھی ہوئی تھی۔ امام صاحب نے سارہ کو اور ہم سب کو مبارک باد دی کہ اب سارہ حق کے راستے کی اک مسافر تھی۔

سارہ کی ماما کے آنسو تھم نہیں پارے تھے۔ سارہ نے انہیں گلے لگا کر بے حد پیار کیا۔ ربیکا بھی بیگلی پلکیں لیے انہیں تھکتی رہی۔ میں نے مسز آئزک کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا کہ اس وقت انہیں تسلی دینے کا اس سے بہتر ذریعہ مجھے اور کچھ دوسرا نظر نہ آیا۔

مسز آئزک۔۔۔۔۔ جینی فر آئزک۔۔۔۔۔ کتنی عظیم عبورت تھی۔ کیسا عجیب رشتہ تھا ان دو ماں بیٹی کا، سہیلیوں سے بھی بڑھ کر، جیسے یک جان دو قالب ہوں۔ دنیا کی کون سی ماں ہوگی جو یوں آدھی رات کو اپنی بیٹی کو اپنا مذہب بدلتے وقت حوصلہ دینے کے لیے گھر سے چلی آئے۔ اپنے شوہر کی برسوں کی رفاقت اور اپنے گھر اور اپنے ازدواجی رشتے کو بھی خطرے میں ڈال کر، واقعی یہ سب بہت خاص لوگ تھے۔ سارہ، اس کی ماما۔۔۔۔۔ ان کا درجہ کچھ الگ ہی تھا۔ ان کی مٹی جس سے یہ لوگ بنائے گئے تھے ضرور کچھ خاص رہی ہوگی۔

امام صاحب نے وہ جذباتی لمحے گزر جانے کے بعد ہم سے پوچھا۔

”خاتون کا نام سارہ ہی ٹھیک ہے یا آپ کوئی دوسرا نام رکھنا چاہیں گے؟“

مسز آئزک نے سارہ کی جانب اور سارہ نے میری جانب دیکھا۔ میرے منہ سے جیسے خود بخود نکل گیا۔

”نہیں ہم سارہ کا نام بدل رہے ہیں۔“

”بہت بہتر۔ نیا نام بھی تجویز کر دیجئے سب کے سامنے۔“

”ایمان۔“

سارہ نے اور ربیکا نے بیک وقت چونک کر میری جانب دیکھا۔

”جی۔۔۔۔۔ سارہ کا نیا نام نہیں ”ایمان“ تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض



## کبھی الوداع نہ کہنا

جب میں اور کامران لندن بیتھروائیر پورٹ کے لیے نکلے تو اسی وقت بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ایئر پورٹ پر پہنچتے پہنچتے یہ بوندا باندی شدید بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ میں راستے بھر گاڑی میں اس دن کے اخبارات پڑھتا رہا جنہوں نے سارہ کے قبول اسلام کی خبریں بڑی بڑی سرخیوں کی صورت میں چھاپی تھیں۔ یہودی زیر اثر اخبارات نے اسے ایک جذباتی لڑکی کی اپنی محبت کے لیے مذہب کی قربانی سے تعبیر کیا تھا۔ اور پہلے کی سارہ اور آج کی ایمان کے لیے بہت سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ محبت کے چند متوالے اخبارات نے اسے محبت کی جیت قرار دیا تھا اور سر آئزک کی تمام اخبارات میں شدید سبکی کے حوالے دیے گئے تھے۔ سر آئزک نے ایمان کو اپنی وراثت اور جائداد سے عاق کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ایک انٹرویو میں انہوں نے ایمان کو 30 دن کی مہلت دی تھی کہ اگر وہ اب بھی اپنی غلطی کا ”اعتراف“ کر کے تائب ہو جائے تو وہ اسے دوبارہ اپنی ولدیت اور وراثت کا حق بخشے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں مجھ پر اپنی بیٹی کو بھڑکانے اور اسے ”راہ راست“ سے بھٹکانے کا بھی الزام لگایا تھا۔ اخبارات میں میرے لندن چھوڑ کر جانے کی خبریں بھی موجود تھیں۔ ایمان کا تمام اخبارات میں صرف ایک ہی جملہ بطور بیان لگایا گیا تھا کیونکہ شاید اس نے اخباری نمائندوں اور میڈیا کے سامنے کچھ بولنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ: سچ کانٹوں سے بھرا اک بے حد دشوار راستہ ہے اور محبت، ہمیں ان کانٹوں بھری راہ پر چلنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔“

جیسے ہی ہم ایئر پورٹ کی پارکنگ میں رُکے تو گاڑی سے اترتے ہی مجھے اپنے شناسا چہروں کا بے پناہ جھوم نظر آیا۔ سب سے پہلے ربیکا بارش میں ہنسی دہڑ کر میری طرف آئی آتے ہی میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگی کہ: مجھے بھیڑ سے دور لے گئی۔ بارش ہم دونوں کے وجود کو

اور تکالیف اور کتنے انگارے بچھے ہوئے تھے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ایک بہادر لڑکی ہے اور وہ ہر مشکل کے سامنے ڈٹ جانا جانتی ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں نے مولوی علیم تک پہنچنے کے لیے بھی مذہب کا سہارا لیا تھا۔ مذہب کو ایمان کے گھر جانے کے لیے ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کیا تھا لیکن میرے اندر شاید کھوٹ تھا۔ لیکن اس سچی لڑکی نے مذہب کو مجھ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ یا میرے دل میں اترنے کی صرف ایک سیڑھی نہیں سمجھا۔ بلکہ اس نے جو بھی کیا سچے دل سے کیا۔ اس کی کسی محبت میں کوئی منافقت نہیں تھی۔ نہ ہی میری محبت میں اور نہ ہی خدا کی محبت میں۔۔۔۔۔ وہ دونوں محبتوں میں سچی تھی۔

ہم چاروں لوگ صبح کی شدید دھند میں ایک دوسرے سے وداع ہو کر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ ایمان کی نظریں جاتے وقت تک میرا ہی طواف کرتی رہیں۔ وہ جانتی تھی کہ اگلے دن میری واپسی کی فلائٹ ہے اور اب چند گھنٹیاں ہی باقی رہ گئی ہیں جس کے بعد ہم جدابو جائیں گے اور کون جانے یہ جدائی پھر کتنی صدیوں پر محیط ہوگی۔۔۔۔۔

میں اور ربیکا دیر تک ایمان کی سفید پٹیل کو لندن کی گہری دھند میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔ جیسے دھواں، دھواں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ پھر ربیکا نے بھی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

〇〇







آف کر لیا۔ میں جہاز کی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا نیچے بھگتے ہوئے لندن کو دھند میں تحلیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جہاز کی کھڑکی پر بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ برس کر اس کی دھندلی اسکرین پر راستے سے بناتی ہوئی نیچے خلاؤں میں کہاں غائب ہو جاتی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ آج سے چھ مہینے قبل جب میں لندن پہنچا تھا اس دن بھی ایسی ہی بارش ہو رہی تھی اور آج جب میں نے اس شہر کو الوداع کہنا تھا تب بھی بارش میری ساتھی تھی۔

”یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برستی رہیں، تب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں، اور کبھی ہر پل ہمارے من کو جل تھل کیے رکھتی ہیں۔ لیکن باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔“

میں نے آخری مرتبہ سفید دھوئیں جیسی دھند میں غائب ہوتے لندن کو دیکھا اور پھر تھک کر اپنی آنکھیں موندھ لیں۔۔۔۔۔ جانے کیوں اس لمحے مجھے اپنی اک پسندیدہ نظم کے چند بول بے تحاشا یاد آ رہے تھے۔

”میں نے پوچھا کیسے ہو؟

بدلے ہو یا ویسے ہو؟

روپ وہی انداز وہی

یا پھر اس میں کوئی کمی؟

ہجر کا کچھ احساس تو ہوگا

کوئی تمہارے پاس تو ہوگا؟

میں بچھڑا یہ مجبوری تھی

کب منظور مجھے دُوری تھی

ساتھ ہمارا کب چھوٹا ہے

روح کا رشتہ کب ٹوٹا ہے

آنکھ سے جو آنسو بہتے ہیں

تم کو خبر ہے کیا کہتے ہیں

۔۔۔۔۔ اور دیکھ لینا۔۔۔۔۔ تب بھی یہ پھول میرے انتظار کی طرح تازہ ہوں گے۔۔۔۔۔ یہ کلیاں کبھی نہیں مرجھائیں گی۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔“

ایمان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جدائی کا زہر پھر سے اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ شاید محبت کی تخلیق ہی جدائی کے لیے۔۔۔۔۔ جدائی کے باعث ہوئی ہوگی۔۔۔۔۔ جدائی نہ ہوتی تو شاید محبت بھی وجود میں نہ آتی۔۔۔۔۔ جیسے بندگی نہ ہوتی۔۔۔۔۔ تو بندہ بھی کبھی جنم نہ لیتا؟“

ایمان کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ اندر سے اب باقاعدہ بورڈنگ لیڈی میرا نام پکارنے لگی تھی۔ ایمان نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”جار ہے ہو۔۔۔۔۔؟“

”اس کے اس انداز پر میرا دل جیسے ڈوب سا گیا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے بہت قریب۔۔۔۔۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال بکھیر دیے۔ ایمان ہلکے سے مسکرا دی۔ پھر میں نے پلٹ کر اس کی جانب نہیں دیکھا اور تیزی سے بورڈنگ لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ گہرے رنگ کا کالا چشمہ اس وقت بھی میرے بہت کام آیا۔ جسے میں نے غلت میں اپنی آنکھوں پر پہن لیا۔

”مجھے بارشوں میں چلنا اچھا لگتا ہے کیونکہ ایسے میں لوگ میرے آنسو۔۔۔۔۔“

میں نے دُور جا کر پلٹ کر آخری مرتبہ دیکھا۔ سب سے آگے شیشے کی دیوار کے پاس ایمان، کامران پھر ربیکا، مسز آنزک، پارکر، جم، ڈیوڈ، ٹینا اور پھر جانے کون کون کھڑا میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلارہا تھا یہ لوگ میرے لیے یہاں جمع ہوئے تھے۔ کون کہتا ہے میں یہاں اکیلا تھا۔ کون کہتا ہے میں خالی ہاتھ لندن سے واپس جا رہا تھا۔ میں نے یہاں کا ایک ایک رشتہ دُنیا جہاں کی دولت سے مہنگا پایا تھا۔ آج تو میں خود کو دُنیا کا سب سے امیر شخص محسوس کر رہا تھا۔

آخری مرتبہ پلٹنے سے پہلے میں نے ان سب کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ایمان کی آنکھوں سے ٹپکتے دو آنسو میں یہاں سے بھی کھڑے ہو کر اپنے دل کی زمین پر ٹپکتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر میں پلٹا اور مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ جہاز نے جلد ہی ٹیک



میں نے کہا آواز تمہاری  
آج بھی ہے ہمارا ہماری

پھول وفا کے کھل جائیں گے  
اک دن ہم پھر مل جائیں گے

☆A☆S☆I☆F☆

***We at PakSociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers***

***If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com***

***or  
send message at  
0336-5557121***